ندیا کہاں سے تیرا دیس

شہزاد منظر

ندیا کہاں ہے تیرا دیس

ایک ناولٹ اور تیرہ افسانے

شہزاد منظر

ناشر

منظر پبلیکیشنز

اے، ۳۶- واجد اسکوائر- بلاک نمبر ۱۶ گلشنِ اقبال کراچی

جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ

اشاعتِ اوّل: ۱۹۹۰ء

تعداد اشاعت: ایک ہزار

طابع: انجمن پریس نشتر روڈ۔ کراچی

قیمت: ساٹھ روپے

فہرست

۱۔ کچھ اس کتاب کے بارے میں

الف

۲۔ ندیا، کہاں ہے تیرا دیس ۱

۳۔ سراب ۱۳

۴۔ سزا ۲۲

ب

۵۔ یوٹوپیا ۳۷

۶۔ تیسرا وطن ۵۵

۷۔ اجنبی ۸۷

۸۔ رات کے پچھلے پہر ۱۰۲

۹۔ دشمن ۱۰۷

۱۰۔ پچھتاوا ۱۱۶

۱۱۔ اب ہم کہاں جائیں گے ماں؟ ۱۲۱

ج

۱۲۔ اذیتوں کی شاخ ۱۲۵

۱۳۔ آنکھوں کے سمندر روتے نہیں ۱۳۲

۱۴۔ جوالا مکھی ۱۴۰

۱۵۔ فسانۂ رومان بہار ۱۴۸

مُصنّف کی دیگر کتابیں

(۱) جدید اردو افسانہ (تنقید) مطبوعہ ۱۹۸۲ء
(۲) اندھیری رات کا تنہا مُسافر (ناول) مطبوعہ ۱۹۸۴ء
(۳) ردِّ عمل (تنقید) مطبوعہ ۱۹۸۶ء
(۴) علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ (تنقید) مطبوعہ ۱۹۹۰ء
(۵) ندیا، کہاں ہے تیرا دیس (افسانے) مطبوعہ ۱۹۹۰ء
(۶) محمد حسن عسکری، ایک مطالعہ (تنقید) زیرِ طبع
(۷) غلام عبّاس، ایک مطالعہ (تنقید) زیرِ طبع
(۸) راجندر سنگھ بیدی، ایک مطالعہ (تنقید)
(۹) جدید اردو ناول (تنقید)
(۱۰) مشرق و مغرب کے چند مشاہیر ادبا (تنقید)
(۱۱) فحش ادب کیا ہے؟ (تنقید)
(۱۲) سفرِ ناتمام (سفرنامہ)

کچھ اس کتاب کے بارے میں

اردو افسانے کے بارے میں ہمارے بعض ناقدین نے جو گمراہیاں پھیلائی ہیں، ان میں ایک بڑی گمراہی یہ ہے کہ اردو افسانے میں حقیقت نگاری کا دور ختم ہو چکا ہے اور اس میں جو امکانات تھے، وہ ختم ہو چکے ہیں۔ یہ علامت نگاری کا دور ہے۔ اس لیے اب صرف علامتی افسانہ لکھنا چاہیے۔ یہ ناقدین یہ دعویٰ اس وقت کر رہے تھے، جب راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور قرۃ العین حیدر سیدھے سادے بیانیہ اور حقیقت پسندانہ افسانے اور ناول لکھ رہے تھے اور قرۃ العین حیدر آج بھی اسی اسلوب میں ادب تخلیق کر رہی ہیں۔ ایسے دور میں جب کہ ہر جانب علامتی افسانہ نگاری کا شہرہ ہے، میں نہایت عجز و انکسار کے ساتھ اپنے افسانوں کا یہ مجموعہ "ندیا، کہاں ہے تیرا دیس" قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ یہ سارے افسانے بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ حقیقت نگاری کے اسلوب میں فن کارانہ اظہار کے امکانات ہیں یا نہیں؟ اس کا فیصلہ ناقدین نہیں، قارئین کریں گے۔

میں افسانے میں علامتی طرزِ اظہار کا مخالف نہیں۔ علامتی افسانے کی اپنی جگہ اہمیت ہے اور علامتی طرزِ اظہار بعض اوقات ضروری بھی ہوتا ہے، لیکن کس افسانے کو علامتی اسلوب میں لکھنا ضروری ہے اور کسے سیدھے سادے بیانیہ انداز میں۔ اس کا فیصلہ موضوع کے مطابق کرنا چاہیے۔ اظہار کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ علامت نگاری ان میں سے ایک طریقہ ہے۔ علامت نگاری کو مقصود بالذات سمجھنا

درست نہیں ہے۔ ہر شخص کامیاب علامتی افسانہ نہیں لکھ سکتا۔ اس کا تعلق مصنّف کے مزاج اور افتادِ طبع سے ہوتا ہے۔ میں علامتی افسانہ لکھنے کی قطعی صلاحیت نہیں رکھتا، لہٰذا میں نے کبھی اراداً علامتی افسانہ لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے باوجود اگر میرے بیانیہ افسانے سے خود بخود علامتی مفاہیم نکلتے ہیں (جیسا کہ ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے) تو ایسا عین ممکن ہے۔ دراصل کسی شے کو دیکھنے اور پرکھنے کا اپنا زاویۂ نگاہ ہوتا ہے۔ ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ کسی تخلیق سے کوئی بھی مفہوم اخذ کرے۔ اس کا تخلیق کار سے براہِ راست تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے بعض اوقات سیدھے سادے بیانیہ افسانے اور ناول سے بھی علامتی مفاہیم برآمد ہو سکتے ہیں، جیسے میلوِیل کے "موبی ڈِک" ہیمنگوے کے "بوڑھا اور سمندر" اور کامو کے "طاعون" سے۔

اس مجموعے میں شامل افسانے میرے منتخب افسانے ہیں۔ میں نے بہت سے افسانوں کو اس میں اس لیے شامل نہیں کیا کہ وہ میری مشق کے زمانے کے افسانے تھے اور میری نظروں سے گر چکے تھے۔ یہ افسانے کیسے ہیں اور کیسے نہیں؟ اس کا فیصلہ قارئین کرام کریں گے۔ میں اس ضمن میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے ادبی کیریئر کا آغاز بحیثیت افسانہ نگار کیا تھا۔ میرا پہلا افسانہ "پنچھی باورا" کے عنوان سے اگست ۱۹۴۶ء میں ماہنامہ "تصویر" رام پور اسٹیٹ (مدیر: اشرف رام پوری) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد میں نے عرصے تک افسانہ لکھنا چھوڑ دیا اور صرف ادب کا مطالعہ کرتا رہا۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں چند افسانے لکھے جو کلکتہ کے مقامی جرائد میں شائع ہوئے۔ پھر میں صحافت کے پیشے میں آ گیا اور تنقیدی مقالات لکھنے لگا۔ اس طرح افسانے لکھنے کی رفتار سست ہو گئی اور میں سال میں ایک یا دو سال میں ایک افسانہ لکھنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ یہ بھول گئے کہ میں افسانے بھی لکھتا تھا۔ تواتر کے ساتھ ادبی مقالات لکھنے کی وجہ سے میں بحیثیت ناقد تو مشہور ہو گیا، لیکن افسانہ نگار کی حیثیت سے میری شناخت بری طرح متاثر ہوئی۔ ۱۹۸۷ء میں میرے ناول "اندھیری رات کا تنہا مسافر" کی اشاعت کے بعد لوگوں نے مجھے بحیثیت ناول نگار تو پہچان لیا لیکن پھر بھی ادبی حلقوں کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میں افسانے بھی لکھتا ہوں۔

افسانے کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ بہت ہی مشکل فن ہے اور اچھا اور یادگار افسانہ لکھنا برسوں کی ریاضت کا متقاضی ہے۔ مرحوم غلام عباس کا خیال تھا کہ ہر وہ شخص افسانے لکھ سکتا ہے جو خط لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو، لیکن افسانہ نگاری کا فن اتنا آسان نہیں کہ ہر خواندہ شخص اچھا افسانہ لکھ سکے۔ جس طرح اچھی غزل کہنے کے لیے کہنہ مشق ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح بڑا افسانہ لکھنے کے لیے بھی عمر بھر کی ریاضت ضروری ہوتی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے ۔ مجھے اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی نہیں ہے۔ لیکن صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اظہار کی بے پناہ خواہش کے تحت افسانے لکھتا ہوں اور اس وقت تک نہیں لکھتا جب تک کہ کسی بات یا واقعے سے متاثر نہ ہوں اور لکھنے پر مجبور نہ ہو جاؤں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے افسانے لکھنے کے درمیان بعض دفعہ بہت زیادہ وقفہ ہو جاتا ہے اور بعض افسانے میں چار چار اور پانچ پانچ سال کے بعد مکمل کرتا ہوں، مثلاً "سراب" لکھنے کا خیال ذہن میں پیدا ہونے سے لے کر اُسے آخری شکل دینے تک کا عرصہ پانچ سال پر محیط ہے۔ اِس کے بعد بھی میں افسانے میں ترمیم و اضافہ کرتا رہتا ہوں۔

اپنے افسانوں کے بارے میں کیا لکھوں؟ بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ قارئینِ کرام جب افسانہ پڑھیں گے تو اس میں قطعی مختلف "ذائقہ" پائیں گے۔ میں نے لفظ "ذائقہ" اس لیے استعمال کیا ہے کہ میں تخلیق اور مطالعۂ ادب کا ایک مقصد حصولِ مسرّت بھی سمجھتا ہوں، تخلیقِ ادب کا اوّلین مقصد تخلیق کی مسرّت ہے۔ اِس لیے اس کے مطالعے کا مقصد بھی حصولِ مسرّت ہونا چاہیے ۔ مجھے ادب کے دیگر مقاصد سے انکار نہیں۔ ادب کا مقصد تخلیق کی مسرّت بھی ہو سکتا ہے اور معاشرے کی اصلاح بھی۔ اظہارِ ذات بھی ہو سکتا ہے اور حیات و کائنات کی تعبیر و تفسیر بھی۔ ادب سب کچھ ہو سکتا ہے، لیکن اسے سب سے پہلے ادب ہونا چاہیے اور جب ادب ہر حال میں ادب ہوگا تو اس کا ایک مقصد لطف و انبساط بھی ہوگا۔ میں نے لفظ مختلف ذائقہ استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس مجموعے میں شامل افسانوں میں آپ کو قدرے مختلف لینڈ اسکیپ ملے گا۔ یہ ہے

سابق مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلہ دیش) کا لینڈ اسکیپ۔ میری زندگی کا بڑا حصہ بنگال (مغربی اور مشرقی بنگال) میں گزرا ہے۔ میں رہنے والا تو عظیم شہر کلکتے کا ہوں، لیکن زندگی کا طویل عرصہ مغربی بنگال کے ضلع چوبیس پرگنہ اور مشرقی بنگال کے مختلف ضلعی شہروں اور دیہاتوں میں گزرا ہے۔ میں نے وہاں کے عوام، ان کی روزمرّہ زندگی اور ان کے معاشرے کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ سو میں نے ان کی زندگی سے متاثر ہو کر جو افسانے لکھے ہیں (مثلاً "ندیا، کہاں ہے تیرا دیس"، "سراب" اور "سزا") وہ اردو میں قطعی مختلف طرز کے افسانے ہیں۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میں نے مشرقی پاکستان کی دیہی زندگی کے بارے میں اردو میں پہلی بار افسانہ لکھا ہے، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں نے مشرقی پاکستان کی دیہی زندگی کو اس کی تمام تر اصلیت کے ساتھ منعکس کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشرقی پاکستان کے عوام، فطرت (سیلاب، طوفان اور دریاؤں کے کٹاؤ) کے خلاف جس بے جگری سے نبرد آزما رہتے ہیں، اس کی بہت کم مثال ملتی ہے۔ میں نے اپنے پہلے افسانے "ندیا، کہاں ہے تیرا دیس" میں اسے ہی موضوع بنایا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ادبی حلقوں میں اس افسانے کو پسند کیا گیا۔ "سراب" ایک انقلابی کے آدرش کی شکست و ریخت کی کہانی ہے، جب کہ "اذیتوں کی شاخ" ایک آدرش وادی سیاسی نظر بند کی زندگی کے المیے کی داستان ہے۔ "سزا" اس بدنصیب عورت کی کہانی ہے جو پے در پے حادثات کا شکار ہو کر اپنے آبائی گاؤں سے نکل کر پہلے ڈھاکہ کی سڑکوں اور پھر عشرت کدے تک پہنچ گئی۔

اس مجموعے کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں ہجرت کے آشوب سے متعلق افسانوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ میری نظر میں یہ اس مجموعے کا سب سے اہم حصہ ہے۔ اہم اس لیے کہ اس میں ان بدنصیب انسانوں کے المیے کو پیش کیا گیا ہے جنھوں نے بہتر مستقبل اور پُرسکون زندگی کی امید میں اپنے آبائی وطن کو ترک کرنے کی غلطی کی اور انھوں نے جس زمین پر پناہ ڈھونڈی، اُس نے انھیں (وجہ خواہ کچھ بھی ہو) قبول کرنے سے انکار کر دیا اور وہ بار بار ہجرت کے کرب کو برداشت کرنے پر مجبور ہوئے۔

میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ایک ایسا ناول لکھنا تھا جس میں دوسری جنگِ عظیم، جدوجہدِ آزادی اور قیامِ پاکستان سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ تک کی داستان بیان کی گئی ہو۔ میں نے اس سلسلے میں ذہنی تیاریاں مکمل کرلی تھیں، لیکن حالات نے مجھے اسے لکھنے کا موقع نہیں دیا، لیکن میں نے زندگی میں جو تجربات حاصل کیے اور ترکِ وطن کے بعد جن حادثات سے دوچار ہوا، اس سے متاثر ہوکر میں نے چند افسانے لکھے ہیں، جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔ اگر ان افسانوں کو آپ ایک سیکوئنس میں پڑھیں (یعنی "یوٹوپیا" سے لے کر "اب ہم کہاں جائیں گے ماں؟" تک) تو آپ کو ناول کا لطف آئے گا۔ ان افسانوں کے اگرچہ عنوانات اور کرداروں کے نام مختلف ہیں، لیکن زمانی ترتیب موجود ہے۔ "یوٹوپیا" قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے ترکِ وطن کی کہانی ہے اور "اب ہم کہاں جائیں گے ماں؟" کراچی کے لسانی و نسلی فسادات کی کہانی۔ ان کے درمیان کے افسانے (مثلاً "میرا وطن"، "اجنبی"، "دشمن" اور "پچھتاوا" وغیرہ) مشرقی پاکستان کے سیاسی نشیب و فراز، لسانی اور نسلی آمیزش اور خانہ جنگی سے رونما ہونے والے انسانی المیے پر مبنی ہیں۔

اس مجموعے میں شامل افسانہ "یوٹوپیا" کی اشاعت کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ میں نے یہ افسانہ سقوطِ ڈھاکہ سے ایک یا دو سال قبل لکھا تھا۔ اسے میں نے سب سے پہلے "اوراق" میں بھیجا، جسے ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑی تعریف کرنے کے بعد یہ کہہ کر واپس کردیا کہ ملک میں مارشل لا نافذ ہے اس لیے اس کی اشاعت ممکن نہیں ہے۔ میں نے اسے ماہنامہ "کتاب" (لکھنؤ) میں بھیج دیا، جسے عابد سہیل نے تعریف کرنے کے بعد یہ کہہ کر شائع کرنے سے معذرت کرلی کہ اس میں بعض ایسی باتیں ہیں، جن کے پیشِ نظر ہندوستان میں اس کی اشاعت ممکن نہیں ہے۔ یہ افسانہ میں ڈھاکہ سے کراچی آتے وقت اپنے ساتھ لے آیا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بہت دنوں کے بعد اسے نسیم درّانی نے اپنے رسالہ "سیپ" میں شائع کیا۔ اس افسانے میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں تھی۔ میں نے صرف یہ دکھایا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک خاندان مشرقی پاکستان

ہیں "لوز" اگوں تجربات سے گزرنے اور بنگالی، غیر بنگالی لسانی اور نسلی فسادات میں تباہ ہونے کے بعد ہندوستان لوٹ جاتا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ سے قبل جو بات محض افسانہ تھی، وہ اس کے بعد حقیقت بن جاتی ہے اور لاکھوں کی تعداد میں بہاری بنگلہ دیش سے فرار ہو کر ہندوستان میں پناہ گزین ہو جاتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنے ہوئے بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ مشرقی پاکستان کی خانہ جنگی کے نتیجے میں جو انسانی المیہ رونما ہوا، تاریخِ پاکستان میں خواہ اس کا ذکر آئے یا نہ آئے، اردو ادب کی تاریخ میں وہ افسانوں، نظموں اور اشعار کی صورت میں ضرور محفوظ رہے گا اور آنے والی نسلیں ادب کے آئینے میں دیکھیں گی کہ ایک مذہب کے ماننے والوں اور ایک ہی ملک کے رہنے والوں نے ایک دوسرے پر کیا کیا ستم نہ ڈھائے۔ میرے افسانے اس المیے کو پیش کرتے ہیں۔

میرے یہ افسانے میرے تجربات اور مشاہدات کے عکاس ہیں۔ ان میں صرف جگ بیتی ہی نہیں، آپ بیتی بھی ہے۔ جو لوگ میری بھی زندگی سے واقف ہیں۔ وہ ان افسانوں اور اس کے کرداروں میں مجھے ضرور تلاش کر لیں گے۔ شیلر نے کیا خوب کہا ہے کہ "... ہماری قوتِ متصورہ کی کوکھ میں سے جتنے کردار جنم لیتے ہیں۔ ان سب میں ہم خود بخود موجود ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی اپنے آپ کو کئی آئینوں میں دیکھتا ہے" افسانے کے لیے ہم اپنی ذات اور اردگرد کے واقعات میں ہی کہانی تلاش کرتے ہیں۔ یہ کہانی ذاتی بھی ہوتی ہے اور غیر شخصی بھی۔

اس مجموعے میں تمام افسانوں میں مجھے کس حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ اس بارے میں قارئین کی رائے جان کر خوشی ہوگی۔

مستقل پتہ:
اے ۲۶۰ - واجد اسکوائر
بلاک ۱۶، گلشن اقبال
کراچی ۷۵۳۰۰

شہزاد منظر
یکم جولائی ۱۹۹۰ء

ندیا، کہاں ہے تیرا دیس

"اونووی
ایکیٹی کو تھائی شُودھائی شُودھو تومارے
بولو کو تھائے تومار دیش
نے اِی کی چولار شیش
اے کول بھینگے او کول تومی کوڑو
جارائے کول او کول، دو کول گیچھے
تارلاگی کی کو رو؟"

اس کی تیز آواز ندی کے خاموش سینے کو چیرتی ہوئی فضا میں گونج رہی تھی اور وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر، بھاٹیالی گانے میں کھویا ہوا تھا۔ سورج دن بھر کے سفر سے تھک کر تیزی کے ساتھ اپنی کٹیا کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ اس کے چہرے کی تازگی اور رنگ و روغن ماند پڑ چکا تھا جس کی وجہ سے اس کی تمازت کم ہو چکی تھی۔ ندی گہری خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف لہریں

اس کی کشتی سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں۔ جس سے چپ چپ کی ہلکی سی آواز پیدا ہو رہی تھی اور وہ ہوا کے دوش پر اپنی کشتی کا گہرا کتھئی رنگ کا بادبان پھیلائے، بڑے اطمینان سے بھاٹیالی گا رہا تھا اور ندی سے بار بار، صدیوں پرانا اور کبھی نہ ختم ہونے والا سوال کر رہا تھا۔

"اے ندی تو کس دیس کی رہنے والی ہے؟

میں تجھ سے صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔

تُو کس دیس کی رہنے والی ہے؟

کیا تیری لہریں کہیں پر رک نہیں سکتیں؟

تُو ایک ساحل کو توڑ کر دوسرے ساحل کو تعمیر کرتی ہے

لیکن جس کے دونوں ساحل ٹوٹ چکے ہوں

تُو اُس کے لیے کیا کرتی ہے؟

تو کیا کرتی ہے؟؟؟

تُو کیا کرتی ہے؟؟؟

اس نے بار بار تنہائی میں ندی سے یہ سوال کیا تھا۔ مختلف موقعوں پر مختلف طریقوں سے یہ سوال پوچھا تھا لیکن اسے اپنے سوال کا کبھی کوئی جواب نہیں ملا۔ اس سوال کے جواب میں ہر طرف خاموشی چھائی رہی۔ اس نے ندیوں اور نالوں کے اس دیس میں اپنی ساری زندگی گزار دی تھی اور وہ اپنی بیتالیس سالہ زندگی میں قدرت کی تخریب و تعمیر کے بے شمار تماشے دیکھ چکا تھا اور خود کئی بار ان تماشوں میں حصہ لے چکا تھا۔

وہ میگھنا کے ساحل پر رہنے والا کسان تھا، جو بچپن سے زندہ رہنے اور مٹی کے سینے سے فصل اُگانے کی جدوجہد شروع کر دیتا ہے۔ وہ چھوٹی عمر سے ہی جدوجہد کر رہا تھا اور ابھی تک اس نے ندی سے مکمل شکست نہیں کھائی تھی۔ میگھنا اور کسان کی یہ جدوجہد صدیوں سے جاری تھی۔ اور شاید ابد تک جاری رہے گی۔ وہ اس جدوجہد میں قدرے تھک چکا تھا، اس کے قویٰ مضمحل

ہو چلے تھے، اس کی کمر جھک چکی تھی اور آنکھوں کی بینائی میں فرق آ گیا تھا لیکن اس کے حوصلے اب بھی بلند تھے، ہمت اب بھی جوان تھی اور وہ اب بھی اُس وقت کا منتظر تھا جب میگھنا کے ساحل پر مٹی کی تہیں جم جائیں گی، ندی اپنا رُخ بدل لے گی یا پھر ندی کے درمیان چَر زمین نکل آئے گی۔ وہ جب بھی میگھنا پر سے اپنی کشتی کھیتا ہوا گزرتا۔ اس کی آنکھیں ندی کا جائزہ لیتی رہتیں۔ وہ ندی کے کٹتے ہوئے کنارے کو دیکھتا رہتا اور اس کی بھوکی نگاہیں چَر زمین کو تلاش کرتی رہتیں، جیسے شکاری اپنے شکار کی تلاش میں ہو۔

اسے کشتی پر گزرتے ہوئے جو بھی چَر زمین نظر آتی، تھوڑی اور نا کافی ہوتی اور اُس کی سطح بھی ندی سے زیادہ بلند نہ ہوتی یا پھر بہت ہی دلدلی ہوتی، جس پر کاشت کرنا ممکن نہ ہوتا۔ دوسری جو چَر زمینیں ہوتیں، ان پر پہلے ہی دوسرے کسان قبضہ کر چکے ہوتے۔ وہ برسوں سے خالی اور غیر آباد زمین کی تلاش میں تھا اور اسے ابھی تک یہ زمین نہیں ملی تھی، جس کی وجہ سے اُس نے مجبوراً کشتی پر پناہ لے رکھی تھی، جو اُس کا سہارا بھی تھی اور روزگار کا ذریعہ بھی۔ اُس نے جب سے کشتی پر اپنا بسیرا قائم کیا تھا، اُسے کشتی ہی روزگار فراہم کر رہی تھی۔ وہ مچھلیوں کا شکار کرتا اور انھیں کسانوں کے ہاتھوں فروخت کر کے چاول، دال، نمک، تیل، ایندھن اور مرچ حاصل کر لیتا۔ وہ اپنی کشتی کے ذریعے لوگوں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے پہنچاتا تھا۔ اس طرح اس کی تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی لیکن یہ اتنی زیادہ نہ ہوتی، جس سے اُس کا گزر بسر ممکن ہوتا چنانچہ اسے اپنے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے مچھلیاں پکڑنی پڑتیں۔ میگھنا ہمیشہ ملاحوں پر مہربان رہتی، وہ اپنی مچھلیوں سے اُن کی جھولیاں بھر دیتی ورنہ ان کے لیے زندہ رہنا دوبھر ہو جاتا۔

اُس کا نغمہ ابھی ختم بھی نہ ہو پایا تھا کہ چاند پور جانے والا ایک اسٹیمر ایس ایس شائستہ خاں شور مچاتا ہوا اُس کی کشتی کے بالکل قریب سے گزرا اور اُسے اپنا نغمہ ادھورا چھوڑ کشتی کو سنبھالنا پڑا اور وہ اپنی پوری قوت سے کشتی کا بال پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی کشتی تھوڑی دیر تک

بڑی بڑی لہروں میں ہچکولے کھاتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ سنبھل گئی۔ ندی پھر خاموش اور پُرسکون ہو گئی اور اس کی کشتی ہوا کے سہارے ندی کے بہاؤ پر بہنے لگی۔

اُس کے کانوں میں اچانک کسی کے بلانے کی آواز آئی۔ کوئی ساحل سے اُسے آواز دے رہا تھا۔

اس نے ساحل کی جانب نظر اٹھا کر دیکھا۔ چند لوگ ساحل پر کھڑے لہرا لہرا کر اُس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر رہے تھے۔

اس نے سوچا "چلو اچھا ہوا، چند پیسوں کی آمدنی کی صورت نکل آئی۔ صبح سے ایک کوڑی کی بھی آمدنی نہیں ہوئی۔"

وہ یہ سوچ کر نہایت تیزی سے ساحل کی جانب کشتی کھینے لگا۔

ساحل پر چند مرد اور عورتیں صاف اور اچھے لباس میں کھڑی تھیں۔ ان میں ایک شادی شدہ جوڑا بھی تھا۔ ان کے قریب بانس کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی پالکی رکھی ہوئی تھی، جس میں صرف ایک آدمی بیٹھ سکتا تھا اور جس کے چاروں طرف چادر گھیر کر پردہ بنا لیا گیا تھا۔ دلہن ابھی ابھی اسی پالکی سے اتری تھی اور اس کے عزیز انھیں گاؤں سے رخصت کرنے کے لیے آئے تھے۔

اُنھیں ساحل کے اُس پار داؤد پور جانا تھا۔ رحمت علی سے پیسے کا معاملہ طے ہوتے ہی ایک موٹے اور دیو ہیکل شخص نے تخت تک کیچڑ میں اُتر کر ایک ٹرنک کشتی پر رکھ دیا۔ اس کے بعد پیتل کی ایک کلسی اور سامان سے بھری ہوئی ٹوکری کشتی پر رکھ دی۔ اُس کے ساتھ ہی دولہا اور دلہن ایک عورت کے ساتھ کشتی پر سوار ہو گئے اور رحمت علی نے داؤد پور کی جانب کشتی کھینی شروع کر دی۔ کشتی کے روانہ ہوتے ہی ساحل پر کھڑی ہوئی عورتیں آنچل میں منہ چھپا کر رونے رونے لگیں اور مرد بڑی حسرت و یاس سے کشتی کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جیسے وہ زندگی بھر کی متاعِ عزیز سے محروم ہو گئے ہوں۔

رحمت علی نے سوچا "لڑکی ذات زندگی بھر کی متاع ہی تو ہوتی ہے۔ ہم جسے ناز و نعم سے پال کر جوان کرتے ہیں، اُسے ایک دن کسی اجنبی کے پلّو باندھ دیتے ہیں۔"

رحمت علی کو وہ دن یاد آ گیا جب وہ بھی اسی طرح شمشیر نگر سے کشتی پر اپنی دلہن کو بیاہ کر لایا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ماں اور چاچا محمد دین تھے، لیکن یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ اُس وقت وہ جوان تھا اور ایک امیر کسان بھی۔ دریائے میگھنا کے کنارے اس کی دس بیگھہ نہایت زرخیز زمین تھی جس پر وہ دھان کے علاوہ گنّے اور پٹ سن کی بھی کاشت کرتا تھا اور جس کی آمدنی سے اُس نے میگھنا کے کنارے ایک منزلہ پختہ مکان بنوا لیا تھا۔

اُس کا کھلیان ہمیشہ اناج سے بھرا رہتا اور گھر میں گائے، بیلوں، بکریوں، مرغیوں اور بطخوں کی کوئی کمی محسوس نہ ہوتی۔ اس کے گھر کا آنگن کدو اور سیم کی گھنی بیلوں سے بھرا رہتا اور وہ ان بیلوں کو بانس کے چھجّے بنا کر جھونپڑی کی چھت تک پھیلا دیتا۔ اسی طرح گرمی کے موسم میں اس کا گھر بے حد سرد رہتا۔ اس کی جھونپڑی کے قریب لال ساگ، پالک، مولی گاجر، بینگن اور ٹماٹر کی کیاریاں لگی رہتیں، جو اس کے گھریلو استعمال میں آتیں۔ اس کی زمین پر آم اور کٹھل کے کئی سایہ دار درخت بھی تھے جس کے پھل سے سارا کنبہ لطف اندوز ہوتا۔ وہ جاڑے کا موسم شروع ہوتے ہی بورو دھان کی بوائی شروع کر دیتا اور چیت کے مہینے میں ندی کے کنارے پکّے دھان کے کھیت کا نظارہ بہت ہی خوبصورت لگتا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے چاروں جانب سونا ابل پڑا ہو، اور یہ حقیقت بھی ہے۔ دھان سونا ہی تو تھا جس کے بدلے کسانوں کو مسرّت اور خوش حالی حاصل ہوتی تھی۔

وہ اپنے چھوٹے سے کنبے کے ساتھ نہایت ہی پُرسکون زندگی بسر کر رہا تھا کہ اس نے اچانک ایک دن محسوس کیا کہ میگھنا کی غضب ناک لہریں ساحل کو کاٹتی ہوئی اس کی زمین تک پہنچ چکی ہیں اور اگر میگھنا کے بہاؤ کی سمت میں کمی نہ ہوئی تو اس کی زمین بھی خطرے میں گھر جائے گی۔ اس کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ ساون شروع ہوتے ہی ندی نالوں میں طغیانی آ گئی۔ میگھنا کا بہاؤ

مزید تیز ہو گیا اور اس کے دھارے نے نہایت تیزی کے ساتھ اس کی زمین کو کاٹنا شروع کر دیا۔ اس کی زمین کا چھوٹا چھوٹا حصہ برف کے تودے کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر دریا میں گرتا اور اُسے اِس کے ساتھ ہی ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کا دل بھی اسی طرح کٹ کٹ کر گر رہا ہے۔

دن کے وقت وہ اور چاچا محمد دین نہایت مایوسی کے عالم میں اپنی زمین کو دریا بُرد ہوتے ہوئے دیکھتے اور کفِ افسوس مل کر رہ جاتے۔ کیوں کہ اُن کے پاس اپنی زمین کو بچانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ رات کے وقت جب ہر جانب خاموشی چھا جاتی تو وہ کان لگائے زمین کے دریا میں ٹوٹ کر گرنے کی آواز سنتا رہتا اور اس طرح صبح ہو جاتی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، رحمت علی اور محمد دین کی بے چینی بڑھ رہی تھی، کیوں کہ میگھنا کی لہریں زمین کو کاٹتے ہوئے اس کے پختہ مکان کے قریب پہنچ چکی تھیں، ایک دن قبل آم اور کٹھل کے کئی پیڑ دریا بُرد ہو چکے تھے۔ اب رحمت علی کو اپنے مویشیوں اور گھر کے ساز و سامان کو محفوظ جگہ منتقل کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی ماں، چچا محمد دین اور حلیمہ کو قریب کے گاؤں میں پہنچا دیا اور وہ اپنی زمین پر تنہا رہ گیا۔ بالآخر اس نے وہ دن بھی دیکھا، جب اس کا ایک منزلہ پختہ مکان غصیلے میگھنا کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر اس طرح مسمار ہو کر دریا بُرد ہو گیا جیسے سیمنٹ، اینٹ اور گارے کا بنا ہوا نہ ہو، بچوں کا گھروندہ ہو۔ اس کے پختہ مکان اور اُس سے ملحق جھونپڑیوں کے مسمار ہونے کے بعد وہ اپنی زمین سے واپس چلا آیا اور اپنا سارا اناج اور مویشی فروخت کر کے چاچا محمد دین کے ساتھ ایک بڑی سی کشتی میں منتقل ہو گیا۔ اب اس کا پورا کنبہ کشتی پر آباد تھا اور وہ کسان کی بجائے ماہی گیر کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

وہ روز چاچا کے ساتھ چر کی تلاش میں نکل جاتا اور دن بھر بادبان چڑھائے کئی کئی میل کشتی کھیتا رہتا۔ وہ جلد از جلد نئی زمین حاصل کر کے گھر آباد کرنا چاہتا تھا کیوں کہ حلیمہ کا پاؤں بھاری ہو چکا تھا اور بچے کی ولادت کا وقت تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ آخر کار اس نے کئی ماہ کی تگ و دو کے بعد داؤد پور کے قریب ایک چر زمین کا سراغ لگا ہی لیا اور اس سے

قبل کہ اس کا کسی دوسرے کو علم ہوتا اس نے چاچا محمد دین کے ساتھ اُس پر قبضہ کر لیا۔ یہ زمین اگرچہ بہت بڑی نہیں تھی تاہم نہایت تیزی کے ساتھ دریا کے درمیان اُبھر رہی تھی۔ رحمت علی کو یقین تھا کہ اگر اللہ نے چاہا تو اس کی زمین کے رقبہ میں ضرور اضافہ ہو گا۔

زمین کا سراغ ملتے ہی رحمت علی اور محمد دین نے کشتی ساحل سے باندھ دی، زمین کو بوسہ دیا اور خدا کے حضور میں سربسجود ہو گئے۔ رحمت علی اور محمد دین نئی زمین پا کر بے حد خوش تھے اور خوشی کے مارے ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ رات بھر کھلے آسمان کے نیچے اپنی زمین کی نگرانی کرتے رہے اور دوسرے دن صبح ہوتے ہی محمد دین ہل اور بیل کا انتظام کرنے اپنے آبائی گاؤں روانہ ہو گیا اور رحمت علی جھونپڑی بنانے کے لیے بانس کی تلاش میں نکل گیا۔ حلیمہ اور اس کی ماں، برتن باسن اور گھر کا بچا کھچا سامان لے کر ساحل پر اُتر گئیں۔ وہ بھی نئی زمین پا کر بے حد خوش تھیں اور اب ان میں نئی زندگی شروع کرنے اور اپنے لیے نئی دنیا تعمیر کرنے کی زبردست اُمنگ پیدا ہو گئی تھی۔

رحمت علی اور محمد دین نے دیکھتے ہی دیکھتے خالی اور ویران زمین پر بانس اور پُوالی کے ذریعے جھونپڑی کھڑی کر لی۔ مچھلیاں پکڑنے کے لیے ندی کے کنارے جال لگا دیا اور بیم، کدو اور دوسری سبزیوں کی کیاریاں اور بیلیں لگا دیں تاکہ ساگ سبزی کے لیے ہاٹ جانے کی ضرورت نہ ہو۔ اصل سوال بیل اور ہل کی فراہمی کا تھا۔ چاچا محمد دین نے اپنے آبائی گاؤں کے ساہوکار مہنتو سے دیرینہ تعلقات کا واسطہ دے کر سود پر قرض تو حاصل کر لیا لیکن اس رقم سے دو بیلوں اور ایک ہل کا انتظام نہ ہو سکا۔ ہل اور بیل کے ساتھ بورو دھان کی بھی ضرورت تھی۔ اس کے بنا کھیتی ممکن نہ تھی۔ قرض کی رقم سے بمشکل ایک بیل، ایک ہل اور آدھا من بورو دھان کا انتظام ہو سکا۔ تاہم رحمت علی نے اس کے لیے خدا کا شکر ادا کیا اور صرف ایک بیل سے کام چلا لینے کا فیصلہ کیا۔

اس نے چاچا محمد دین سے کہا کہ وہ ایک بیل کی وجہ سے پریشان نہ ہو، وہ دوسرے بیل

کی جگہ خود ہل میں جُت جائے گا اور جب فصل تیار ہو جائے گی تو وہ اُسے بیچ کر ایک اور ہل خرید لے گا۔ اس کے عزمِ صمیم سے محمد دین بہت متاثر ہوا اور وہ صرف ایک بیل سے کھیتی شروع کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

بارش شروع ہو چکی تھی اور موسم بُوَد دھان کی بُوائی کے لیے قطعی سازگار تھا۔ اُن دونوں نے بڑی محنت سے پہلے ہل چلا کر زمین نرم اور ہموار کی۔ اس کے بعد کیاریاں بنائیں اور پھر دھان کی بُوائی کا کام شروع کیا۔ کبھی بیل کی جگہ رحمت علی جُت جاتا اور کبھی دین محمد۔ دونوں باری باری ایسا کرتے اور یہ بھول جاتے کہ وہ انسان ہیں۔ زمین بے حد نرم تھی اس لیے ہل بڑی آسانی سے زمین کا سینہ چیر دیتا۔ پھر بھی وہ چند گز ہل چلانے کے بعد ہانپنے لگتے اور بارش کے موسم میں بھی وہ پسینے سے شرابور ہو جاتے اور وہ جب تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے بیٹھتے تو انھیں ایسا محسوس ہوتا جیسے انھوں نے کئی من بوجھ اٹھایا ہو۔ اتنی جان لیوا محنت کے دوران وہ جب اپنے اچھے دنوں کے بارے میں سوچتے تو ان کی ساری تھکاوٹ دور ہو جاتی۔ ان میں نیا جوش و ولولہ پیدا ہو جاتا اور وہ ایک بار پھر بہتر مستقبل کی امید میں پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے کام کرنے لگتے....

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی زمین کی صورت بدل گئی۔ اس نے دھان کے ساتھ زمین کے ایک حصّے پر سرسوں کی بھی کاشت کی، جس سے اُس کی زمین سرسوں کے زرد پھولوں سے بے حد دلکش نظر آنے لگی۔ رحمت علی اور محمد دین نے مل کر ایک اور جھونپڑی بنالی اور ساتھ ہی فصل رکھنے کے لیے کھلیان بھی۔ دیکھتے دیکھتے دھان کے پودے ایک ایک ہاتھ نکل آئے اور فصل کے بہت اچھی ہونے کی امید پیدا ہو گئی۔

وہ یہ تیاریاں اس لیے کر رہا تھا کہ اس کے ہاں نئے مہمان کی آمد آمد تھی۔ حلیمہ کے پورے مہینے ہو چکے تھے اور وہ کسی بھی وقت بچّے کو جنم دے سکتی تھی۔ نئے مہمان کی آمد کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ رحمت علی کی ماں نے محمد دین سے کہہ کر ایک تیز دھار دار چھری کا انتظام کر لیا تھا۔

ساتھ ہی کوری ہنڈیا اور پھٹے پرانے کپڑوں کا بھی۔ تاکہ وقت پر کوئی پریشانی نہ ہو۔

ایک دن جب رحمت علی دن بھر کی محنت کے بعد بے خبر سویا ہوا تھا کہ نصف شب کے وقت حلیمہ کو دردِ زہ اٹھا اور وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ اس نے فوراً اپنی ماں کو جگایا اور وہ چراغ جلا کر سرسوں کے تیل سے حلیمہ کے پیٹ کی مالش کرنے لگیں۔ رحمت علی اور محمد دین جھونپڑی سے نکل آئے اور بڑی بے چینی سے صحن میں ٹہلتے رہے۔ رحمت علی سب سے زیادہ پریشان تھا اور اللہ سے دل ہی دل میں زچّہ اور بچّہ کی صحت کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔ رحمت علی کے ہاں یہ پہلی اولاد تھی اس لیے اس کی بے چینی فطری تھی۔ چاچا محمد دین اسے حوصلے سے کام لینے کی تلقین کر رہے تھے لیکن خود ان کا دل انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔

اُن کی بے چینی اس وقت دور ہوئی جب صبحِ کاذب کے وقت اس کے ہاں نومولود بچّے کی چیخ سنائی دی اور اس کی ماں نے مسکراتے ہوئے اسے بیٹا ہونے کی خوشخبری سُنائی۔ وہ مارے خوشی کے اپنی ماں اور چاچا سے لپٹ گیا اور اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لیے فوراً جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔

اُس سال اُس کے ہاں دھان کی کافی اچھی فصل ہوئی اور اس نے فصل بیچ کر ایک جوڑی گائے، کئی مرغیاں اور بطخیں خرید لیں۔ ساتھ ہی چاچا محمد دین، ماں، حلیمہ اور اپنے لیے کپڑے بھی خریدے۔ اس کی زمین پر دیکھتے ہی دیکھتے کیلے اور پپیتے کے پیڑ نکل آئے اور مگھنا کے سینے پر واقع یہ چھوٹا سا جزیرہ سرسبز و شاداب وادی میں بدل گیا اور اس کی خوشیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔

اس طرح ڈیڑھ سال گزر گیا۔

اس دوران حلیمہ کے پاؤں ایک بار پھر بھاری ہوئے اور اس خوش خبری پر سب نے خوشی و اطمینان کا اظہار کیا۔ کسان کے ہاں اولاد بڑی نعمت ہوتی ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ کنبے میں افراد کی کمی ہو۔ رحمت علی اور اس کی ماں نئے مہمان کی آمد کا بے چینی سے

انتظار کر رہے تھے کہ.....

اچانک اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

ہوا کا بہاؤ اچانک تیز ہو گیا۔ بادبان نے اپنا پیٹ مزید پھُولا لیا۔ جس سے کشتی کی رفتار اچانک تیز ہو گئی اور وہ فوراً ہال کو رسّی سے باندھ کر بادبان سمیٹنے لگا۔ ہوا کے دباؤ سے کشتی بُری طرح ڈگمگا رہی تھی۔ اس نے مشرقی افق کی جانب دیکھا۔ مشرقی افق پر اُمنڈتی ہوئی سیاہ گھٹائیں تیزی کے ساتھ اس کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ سیاہ بادل دیکھتے ہی اُس کا ماتھا ٹھنکا اور وہ تیزی کے ساتھ کشتی کھینے لگا۔

وہ گھنے سیاہ بادلوں کو دیکھ کر خوف محسوس کرنے لگا۔ اس کی خواہش تھی کہ جس طرح بھی ہو وہ اس شادی شدہ جوڑے کو جلد از جلد ساحل تک پہنچا دے تاکہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آئے۔ اس نے زندگی میں بڑے بڑے طوفان دیکھے تھے اور خطرناک ترین سیلاب کا مقابلہ کیا تھا۔ دراصل اس کی ساری عمر طوفانوں اور سیلابوں سے مقابلہ کرتے ہوئے گزری تھی۔

رحمت علی کو وہ خطرناک لمحہ یاد آیا جب برسات کا موسم شروع ہوتے ہی ایک روز رات کو اچانک خوفناک طوفان آگیا اور میگھنا کی خوفناک اور بپھری ہوئی لہروں نے ندی کے کنارے آباد، دوسری بستیوں کے ساتھ اس کی زمین کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور چند گھنٹوں کے دوران سب کچھ تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ جس وقت طوفان آیا، وہ حلیمہ اور اپنے بچّے کے ساتھ بے خبر سو رہا تھا۔ اس کی ماں اور چاچا بغل کی جھونپڑی میں محوِ خواب تھے، ابتدا میں صرف تیز ہوا چلتی رہی، پھر بارش کے ساتھ طوفان کی شدّت میں اضافہ ہونے لگا۔ پھر طوفان کے تیز جھونکوں سے جھونپڑی کانپنے لگی۔ ساتھ ہی ایک عجیب و غریب شور بلند ہونے لگا جو لمحہ بہ لمحہ قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔ رحمت علی، محمد دین، اس کی ماں اور حلیمہ سب گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور خوف سے کانپنے لگے۔ ان کی زندگی اچانک خطرے میں گھر گئی اور وہ ایک دوسرے سے لپٹ کر خدا سے اپنی زندگی کے لیے دعائیں مانگنے لگے۔ محمد دین نے خوف و

ہراس کے مارے اذان دینی شروع کردی۔

تھوڑی دیر میں جھونپڑی میں تیزی سے پانی داخل ہونے لگا۔ حتیٰ کہ پانی کمر تک آگیا۔ موت کے خوف سے سب چیخنے لگے۔ اور اپنی جان بچانے کے لیے جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔ رات انتہائی تاریک تھی اور طوفان کے شور کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ حلیمہ اپنے بچے کو سینے سے لگائے خوف سے کانپ رہی تھی اور اس نے رحمت علی کا بازو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ جھونپڑی سے باہر نکلتے ہی پانی کا ایک تیز ریلا آیا اور انھیں بہا کر لے گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، رحمت علی کو کچھ یاد نہ تھا۔ اُسے بس اتنا یاد تھا کہ وہ رات بھر موت و حیات سے جدوجہد کرتا رہا اور جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس نے خود کو اپنے گاؤں سے بہت دور ساحل پر پایا۔ حلیمہ، اس کے بچے، ماں اور چاچا پھر اُسے نہیں ملے۔

رحمت علی نے دیکھا، ہوا کے تیز جھونکوں نے سیاہ بادل کا رُخ دوسری جانب پھیر دیا ہے۔ اب طوفان کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہا جس سے اُسے قدرے اطمینان ہوا اور اُس نے سکون کا سانس لیا۔ رحمت علی طوفانوں اور سیلابوں کا تقریباً عادی ہو چکا تھا۔ کوئی موسم ایسا نہیں گزرتا، جب طوفان یا سیلاب نہ آتا اور سیکڑوں کی تعداد میں لوگ ہلاک اور تباہ و برباد نہ ہوتے۔ اس کے باوجود اس کی طرح کسان ہمّت نہ ہارتے اور میگھنا اور دوسری منہ زور ندیوں کو زیر کرنے کی جدوجہد کرتے رہتے۔

کشتی آخر کار داؤد پور پہنچ گئی۔

اس نے مسافروں کو ساحل پر اتارنے کے بعد ان سے کرایہ وصول کرتے ہی کشتی کو لہروں کے بہاؤ پر چھوڑ دیا اور خود بادبان چڑھا کر اطمینان سے لیٹ گیا۔ کشتی کھینے کی وجہ سے وہ بے حد تھک چکا تھا اور اب اُسے قدرے آرام کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے سوچا، اب وہ کافی ضعیف اور کمزور ہو چکا ہے۔ اب اسے مستقل آرام کرنے کی ضرورت ہے، لیکن اس کی تقدیر میں آرام کہاں؟ اس نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، حد و جہد

کر رہا ہے اور وہ جب تک زندہ ہے، جدوجہد کرتا رہے گا۔ جدّوجہد ہی شاید اس کی تقدیر ہے۔

اُس نے ایک بار پھر اپنی زندگی کے نشیب و فراز پر غور کیا اور اس کا دل چند لمحوں کے لیے افسردہ ہو گیا، لیکن یہ افسردگی زیادہ دیر قائم نہ رہی اور پھر اس کے لبوں پر بھاٹیالی گونج اُٹھی۔

"اے ندی، تُو کس دیس کی رہنے والی ہے؟
میں تجھ سے صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔
تُو کس دیس کی رہنے والی ہے؟
کیا تیری لہریں کہیں پر رُک نہیں سکتیں؟
تو ایک ساحل کو توڑ کر دوسرے ساحل کی تعمیر کرتی ہے
لیکن جس کے دونوں ساحل ٹوٹ چکے ہوں
تُو اس کے لیے کیا کرتی ہے؟
تُو اس کے لیے کیا کرتی ہے؟؟
تُو کیا کرتی ہے؟؟؟

سراب

پدما ندی نے عرصہ ہوا اپنا رُخ بدل لیا تھا اور وہ کشتی سے اترنے کے بعد لوگوں سے اپنے گاؤں کا راستہ پوچھ رہا تھا۔

شری رام پور، جو اس کا گاؤں تھا، جہاں وہ پیدا ہوا، جہاں اس کا بچپن اور جوانی گزری، جہاں اس نے اپنی زندگی کے بہترین شب و روز گزارے، آج اس کے لیے اجنبی تھا، جیسے وہ پہلی بار وہاں آیا ہو۔ اُسے واقعی اپنے گاؤں کا راستہ یاد نہیں تھا۔ بیس سال کے دوران دنیا بدل چکی تھی۔ گرد و پیش میں اس قدر تبدیلی آچکی تھی کہ اسے پہچاننا ممکن نہ تھا۔

بوڑھے ملّاح نے اسے ساحل پر اتارتے ہوئے بتایا "شری رام پور یہاں سے ڈیڑھ میل دور ہے۔ سیدھے کچی سڑک پر چلتے رہنا، جب کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو جائے تو جو پہلا گاؤں آئے گا، وہ شری رام پور ہے۔"

"ڈیڑھ میل دور؟" اس نے دل میں سوچا "شری رام پور یہاں سے ڈیڑھ میل دور ہے؟"

اسے بوڑھے ملّاح کی بات پر یقین نہیں آیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ جب یہاں سے گیا تھا تو شری رام پور پدما سے بمشکل نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ اب ڈیڑھ میل دور کیسے ہو گیا؟ یہ شخص یقیناً مجھے اجنبی سمجھ کر مذاق کر رہا ہے!"

اس نے ملاّح سے کہا" چاچا، شری رام پور تو پدما سے صرف آدھ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ ڈیڑھ میل دور کیسے ہوگیا؟ کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟"

"بوڑھے ملاّح نے غور سے دیکھا، جیسے وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی نظر کافی کمزور ہو چکی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ اُسے پہچان نہ سکا اور اُس سے کہا" کیا تم اسی گاؤں کے رہنے والے ہو؟"

"ہاں" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"لیکن میں نے تو تمہیں کبھی نہیں دیکھا؟ میں تیس سال سے کشتی چلا رہا ہوں۔ میں شری رام پور کے ہر اس شخص کو پہچانتا ہوں جس نے میری کشتی پر ایک بار بھی سفر کیا ہے۔" بوڑھے ملاّح نے دعوے کے ساتھ کہا۔

"میں بیس سال کے بعد گاؤں لوٹ رہا ہوں۔ تم مجھے کس طرح پہچان سکتے ہو چاچا؟"

وہ بھی کافی بوڑھا ہو چکا تھا، لیکن اس ملاّح سے زیادہ نہیں۔ اس کے سر کے بال بہت حد تک سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر جھرّیاں پڑ چکی تھیں۔ صحت بھی کافی گر چکی تھی۔ وہ پہلے کی بہ نسبت بہت نحیف ہو چکا تھا۔ قید کے دوران اُسے تنفّس کی شکایت بھی ہو گئی تھی اور موسم بدلنے یا تیز قدموں سے چلنے سے اس کی سانس پھولنے لگتی تھی۔

"بیس سال کے بعد آ رہے ہو؟ اس عرصے میں تم کہاں رہے؟ گاؤں کیوں نہیں آئے؟" اُس نے ایک ساتھ کئی سوالات کر دیئے۔ کشتی پر اس کے ساتھ آنے والے سارے مسافر اتر چکے تھے، اس لیے بوڑھا ملاّح فارغ ہو کر ناریل کا حقّہ سلگا کر اطمینان سے کش لگا رہا تھا۔

"یہ بہت لمبی کہانی ہے چاچا، پھر کبھی سناؤں گا۔ یہ بتاؤ، کیا واقعی شری رام پور یہاں سے ڈیڑھ میل دور ہے؟ یہ کیوں کر ممکن ہوا؟" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

"آج سے دس سال قبل یہاں بہت ہی خطرناک سیلاب آیا تھا اور اس نے بہت سے دیہات تباہ کرنے کے بعد اپنا رُخ بدل لیا تھا۔ وہ پدما، جو شری رام پور سے نصف میل دور بہتی تھی۔ اب ڈیڑھ پونے دو میل دور بہہ رہی ہے۔ کیا تمھیں اس بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم؟ تم اگر اس گاؤں کے رہنے والے ہو تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ اتنی بڑی تباہی آئی ہو اور تمھیں خبر نہ ہو؟"

بوڑھے ملاح نے حیرت سے کہا اور اپنا ناریل کا حقّہ اس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ ابھی تک یہ یقین کرنے کے لیے آمادہ نہ تھا کہ وہ اس گاؤں کا رہنے والا ہے۔ حقّہ دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔ کتنی مدّت کے بعد اسے حقّہ پینے کے لیے ملا تھا۔ وہ جواب دینے کے بجائے خاموشی سے حقّہ پیتا رہا اور جب اس کا جی بھر گیا تو اس نے کھانستے ہوئے حقّہ بوڑھے ملاح کی جانب بڑھا دیا اور بولا "نہیں، مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ اس عرصے میں میں ملک کے مختلف حصّوں میں پھرتا رہا۔ کسی ایک جگہ سکون نصیب نہیں ہوا۔"

وہ بوڑھے ملاح کو کیا بتاتا کہ اس عرصے میں اس پر کیا گزری۔ وہ عمر قید کے سزا یافتہ قیدی کی حیثیت سے کس طرح ایک جیل سے دوسری اور دوسری جیل سے تیسری جیل میں گھومتا رہا اور اس دوران اسے باہر کی دنیا کی کوئی خبر نہیں ملی۔ وہ ایک سزا یافتہ مجرم کی حیثیت سے جیل کی ان مراعات سے بھی محروم تھا، جو عام سیاسی قیدیوں ... کو حاصل ہوتی ہیں۔ اگرچہ وہ بھی سیاسی قیدی تھا، اور اسے بھی سیاسی جرم کے ارتکاب میں بیس سال قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی، لیکن اُسے اخلاقی مجرم سمجھا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جاتا تھا۔ اس کا کون تھا جو اُس سے خط وکتابت کرتا اور اسے باہر کی خبریں دیتا۔

بوڑھے ملاح نے اس سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟ تم کس کے بیٹے ہو؟"

"اپنی شناخت بتا کر کیا ہوگا؟ اُسے کون پہچانے گا؟" اس نے سوچا۔

"میرا نام جان کر کیا کروگے چاچا؟ اتنے دنوں کے بعد آیا ہوں، مجھے کوئی نہیں پہچانے گا۔"

"پھر بھی نام بتلانے میں کیا ہرج ہے؟ شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

"میرا نام وحیدالدین منڈل ہے۔ میں رحیم الدین منڈل کا بیٹا ہوں۔" اس نے طوعاً کرہاً اپنا نام بتایا۔

"رحیم الدین منڈل کے بیٹے، وحیدالدین منڈل؟ جسے ناتو مرڈر کیس میں پہلے پھانسی اور پھر عمر قید کی سزا ہوئی تھی؟" بوڑھے ملاح نے ایک بار پھر اس کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے پہچاننے کی کوشش کی۔

"ہاں وہی مرڈر کیس!" اس نے تصدیق کی۔

"میرے بیٹے، میں نے لوگوں سے اس بارے میں بہت کچھ سُنا ہے، افسوس بوڑھا ہو جانے کے

باعث تمھیں پہچان نہ سکا۔ تم بہت بدل چکے ہو، بلکہ بوڑھے ہو چکے ہو۔ تمھارے جانے کے بعد تمھارے گھر والوں پر بڑی مصیبتیں نازل ہوئیں۔ تمھاری ماں کو جب معلوم ہوا کہ تمھیں پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔ تو وہ اسی وقت غش کھا کر گر پڑی اور پھر کبھی ہوش میں نہ آئی۔ اس سانحے کے بعد بوڑھ جوت[1] دار رحیم الدین منڈل جو بیمار پڑے تو پھر کبھی صحت یاب نہ ہوئے۔ تم ہی ان کی اکلوتی اولاد تھے۔ تمھاری پھانسی کی سزا اور تمھاری ماں کی موت نے بوڑھے جوت دار کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہے اور بہت بڑی زمین داری چھوڑ کر چل بسے۔ تمھارے کُٹم میں تمھارے سوا اور کوئی نہیں ہے، اس لیے وہ جائیداد آج بھی جوں کی توں پڑی ہے، البتہ تمھاری حویلی اس عرصے میں کئی جگہوں سے گر چکی ہے۔ گزشتہ سال میں جب شری رام پور گیا تھا تو وہاں سے گزر ہوا۔ اب حویلی کا صرف ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ اس کی کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔ وہاں صرف ایک بوڑھی عورت حلیمہ رہتی ہے جو شاید تمھارے گھر کی پرانی ملازمہ ہے اور جو عید، بقر عید یا شب برات کے موقع پر چراغ جلا دیتی ہے۔"

"حلیمہ!" وہ چونک پڑا۔ "حلیمہ ابھی تک زندہ ہے؟ کہیں وہ مانجھی کریم الدین کی بیٹی تو نہیں؟"

حلیمہ کا خیال آتے ہی وہ بے چین ہو گیا اور شری رام پور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

وہاں سے شری رام پور جانے کے لیے کوئی سواری نہیں تھی اور اسے سارا راستہ پیدل طے کرنا تھا۔ بوڑھے ملاح نے اُسے بتایا کہ وہ اگر کچھ دیر مزید انتظار کر لے تو ہو سکتا ہے یہاں سے شری رام پور جانے کے لیے اُسے کوئی بیل گاڑی مل جائے، لیکن اس نے فوراً روانہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ جلد از جلد اپنے گاؤں پہنچنا اور حلیمہ سے ملنا چاہتا تھا۔

وہ بوڑھے ملاح سے اجازت لے کر گاؤں کی جانب چل پڑا۔

اس نے نظر اٹھا کر ہموار میدان کی جانب دیکھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھیت پھیلا ہوا تھا۔ دھان کٹ چکا تھا، جس کے باعث کھیت خالی خالی لگ رہا تھا اور خالی کھیتوں میں گائے اور بکریاں اِدھر اُدھر چر رہی تھیں۔ دور، بہت دور درختوں کا جھنڈ نظر آ رہا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں گاؤں آباد ہے۔ ہو سکتا ہے یہی اس کا گاؤں شری رام پور ہو۔

---

[1] بٹائی پر کاشت کرانے والا زمیندار

شہرِ رام پور، پدما سے واقعی بہت دور ہو چکا تھا۔ وہ جب یہاں تھا تو وہ روز شام کو سیر کرنے کے لیے یہاں پیدل چل کر آجاتا تھا اور پدما کنارے بیٹھ کر سورج کو ڈوبتے اور چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیوں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا تھا۔ وہ زمانہ کتنا سہانا تھا!

وہ گئے دنوں کے خیال میں ڈوب گیا۔

پدما کے کنارے ماجھیوں کی ایک بستی تھی جو چند گھرانوں پر مشتمل تھی۔ یہاں اس کے بچپن کا دوست رحیم اور اس کی بہن حلیمہ رہتی تھی۔ وہ تینوں مل کر دن بھر گاؤں کے آم، جامن اور لیچو کے درختوں پر چڑھتے اور اُدھم مچاتے رہتے۔ جب آم، جامن اور لیچو کا موسم نہ رہتا تو وہ املی، کٹھل اور کھجور کے پیڑوں کو اپنی آماجگاہ بنا لیتے اور اس طرح سارا دن گزر جاتا۔ رحیم اس کا بہت ہی گہرا دوست تھا۔ وہ نشانہ باز بھی غضب کا تھا اور غلیل سے اس طرح تاک کر نشانہ لگاتا کہ کوئی پرندہ اسے سے بچ کر بمشکل نکل پاتا۔ حلیمہ بھی ہمیشہ رحیم کے ساتھ رہتی۔ اس طرح رحیم کے ساتھ ساتھ اس کی حلیمہ سے بھی گہری دوستی ہو گئی تھی۔

گرمی کے موسم میں وہ تینوں دن بھر تالاب میں تیرتے رہتے اور چھوٹے چھوٹے برساتی نالوں میں مچھلیاں پکڑتے۔ رحیم اپنے گھر سے موئی لے آتا جس سے مچھلیاں پکڑنے میں بڑی آسانی رہتی۔ بانس کی تیلیوں سے بنی ہوئی موندھا نما موئی سے وہ تینوں بہت ساری چھوٹی چھوٹی پوٹی اور بیلیا مچھلیاں پکڑ لیتے، جنھیں وہ رحیم اور حلیمہ کو دے دیتا۔ وہ دونوں جب شام کو یہ مچھلیاں لے کر گھر پہنچتے تو رحیم کی ماں بہت خوش ہوتی اور وہ انھیں رات کے کھانے میں بھات کے ساتھ تل کر دے دیتی اور دونوں بھائی بہن اسے بڑی رغبت سے کھاتے۔

رحیم اور حلیمہ کے ماں باپ ماہی گیر تھے اور بہت ہی عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ رحیم جب بارہ سال کا ہو گیا تو اس کا باپ اسے بھی مچھلیاں پکڑنے کے لیے لے جانے لگا۔ اس طرح رحیم اور اس کا ساتھ چھوٹ گیا۔ صرف حلیمہ اس کے ساتھ رہ گئی۔ چند دنوں کے بعد اسے گاؤں کے مدرسے میں داخل کر دیا گیا اسے اب حلیمہ کے ساتھ کھیلنے کا بہت کم موقع ملتا، لیکن جب بھی موقع ملتا وہ حلیمہ سے ملنے ضرور آتا۔ رحیم جب کسی دن اپنے باپ کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے نہ جاتا تو وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیتا۔

پھر وہ مدرسے سے اسکول اور اسکول سے ہائی اسکول پہنچ گیا اور رحیم سے اس کی بہت کم ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اب رحیم اپنے باپ کی طرح پکا ماہی گیر بن چکا تھا۔ مچھلیاں پکڑنا روزی کا واحد ذریعہ تھا، اس لیے رحیم باپ کے ساتھ دن بھر مچھلیاں پکڑتا رہتا اور جو کچھ پکڑتا، اسے لوگوں کے ہاتھوں فروخت کر کے گھر کی ضروریات

پوری کرتا۔ رحیم سے ملاقات نہ ہونے پر بھی حلیمہ سے اس کی ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ حلیمہ روز شام کو ٹوکری میں مچھلیاں لے کر آتی اور اس کی ماں کو دے جاتی۔ یہ اس کے روز کا معمول بن چکا تھا۔ اس کی ماں اس کے عوض اُسے نقد پیسے دے دیتی۔ اس کی ماں ایک رحم دل اور خدا ترس عورت تھی اور پاس پڑوسیوں کا خاص خیال رکھتی تھی اور رحیم اور حلیمہ تو ان کے گھر کے افراد جیسے تھے، ان کا بچپن سے اس کے گھر آنا جانا تھا حلیمہ بے دھڑک اس کے گھر آتی حتیٰ کہ بعض دفعہ راندھنا[1] گھر اور اس کے کمرے میں تک چلی آتی۔ اب حلیمہ سیانی ہو چکی تھی اور اس میں حیا کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔ وہ جب اس کے یا اس کی ماں کے سامنے آتی تو آنچل سے ضرور اپنا سر ڈھانپ لیتی اور ساری سے اپنے جسم کو چھپائے رکھتی۔ اسے اس کا احساس تھا کہ اب اس کا جسم صرف ساری کے آنچل سے چھپتا نہیں ہے۔ وہ بلاؤز سے بے نیاز تھی، اس لیے اس کے لیے جسم کو چھپائے رکھنا اور بھی مشکل ہوتا تھا اور کسی نہ کسی وقت اس کے سینے کے جھلک نظر آ ہی جاتی تھی۔ وہ اس بارے میں بڑی حساس تھی، اسی لیے وہ جب تک اس کے یا اس کی ماں کے سامنے رہتی سمٹی سمٹائی رہتی۔

ہائی اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اسے کالج میں پڑھنے کے لیے شہر جانا پڑا اور اس طرح حلیمہ سے ملاقاتیں بالکل ختم ہو گئیں۔ وہ جب تعطیلات میں گاؤں آتا تو دوسروں کے ساتھ حلیمہ اور رحیم سے بھی ملاقات ہوتی اور وہ اپنا زیادہ تر وقت ان کے ساتھ گزارتا۔ کالج میں پڑھنے کے دوران اس میں بڑی تبدیلیاں آگئیں اور پھر سب کچھ بدل گیا۔

وہ جب بی۔ اے میں پہنچا تو طلبہ کی سیاست سے نکل کر عملی جدوجہد میں شامل ہو گیا۔ اس کی سرگرمیاں جتنی تیز ہوتی گئیں۔ اس کے لیے خطرہ بڑھتا گیا۔ اسے کام کرنے کے لیے دیہی علاقے میں بھیج دیا گیا جہاں لوگ اس سے ناواقف تھے اور وہ ان کے درمیان آسانی سے کام کر سکتا تھا۔

وہ پدما سے کافی دور نکل آیا تھا، لیکن شری رام پور اب بھی بہت دور تھا۔ خیالات میں ڈوب جانے کی وجہ سے اُسے فاصلے کا احساس بھی نہ ہوا اور اس نے اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر بھی نہیں ڈالی۔ وہ کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والی اس کچی راہ پر چل رہا تھا، جو بیل گاڑیوں کی آمد و رفت

---

[1] باورچی خانہ

سے از خود بن گئی تھی - یہ راہ آڑی ترچھی ہوتی ہوئی بہت دور تک نکل گئی تھی۔ گرمیوں کے موسم میں جب دھان کٹ جاتا تھا تو کھیتوں کے درمیان اس قسم کی آڑی ترچھی راہیں خود بخود بن جاتی تھیں، جو بارش کے موسم میں بوائی شروع ہوتے ہی ختم ہو جاتی تھی۔ کسان ان راہوں سے بیل گاڑیوں پر دھان اور پٹ سن لاد کر باٹ[1] اور گھاٹ لے جاتے تھے اور ان کی آمد و رفت سے کھیتوں کے سینے پر خود بخود راہیں بن جاتی تھیں۔

اسے یاد آیا۔

ناٹور کے اسی قسم کے کھیت میں ایک دفعہ کسانوں اور جوت دار کے گماشتوں کے درمیان شدید جھڑپ ہو گئی تھی، جس کے نتیجے میں جوت دار کے کئی گماشتے مجروح اور ہلاک ہو گئے تھے اور اس کے اور اس کے دوسرے ساتھیوں کے خلاف قتل کا مقدمہ بن گیا تھا۔ بات بہت معمولی تھی۔ بٹائی پر کاشت کرنے والے کسانوں کا مطالبہ تھا کہ جو بھی پیداوار ہو اس کا دو حصہ کسانوں کو اور ایک حصہ جوت دار کو دیا جائے جبکہ جوت دار فصل کی نصف تقسیم پر مُصر تھے۔ کسان سبھا نے کسانوں کو منظم کر رکھا تھا اور وہ گاؤں گاؤں گھوم کر انھیں منظم کر رہا تھا۔

اس پر قتل کا مقدمہ چلا اور کئی سال تک چلتا رہا۔ اخبارات میں ناٹور مرڈر کیس کا بڑا چرچا رہا برطانیہ اور دولت مشترکہ کے مختلف ملکوں سے بڑے بڑے قانون دان اس کی پیروی کی غرض سے بلا معاوضہ آئے، لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور اسے اور اس کے تینوں رفقا کو سزائے موت سنا دی گئی، جو بعد میں رحم کی اپیل کے باعث عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔

وہ جب آبائی حویلی میں پہنچا تو شام کا دُھندلکا چھا چکا تھا، جس میں اس کی عظیم الشان حویلی بہت ہیبت ناک لگ رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت سفید ساری میں ملبوس اس کی جانب پشت کیے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھا، جسے اس نے ابھی ابھی جلایا تھا۔

اس نے آواز دی "حلیمہ"

آواز سن کر وہ چونک پڑی۔ اس نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی

---

[1] سہ روزہ بازار

کھلی رہ گئیں۔

"تم ؟" ایک بہت ہی نحیف آواز گونجی۔ وہ حیرت کے مارے اس سے زیادہ نہ کہہ سکی اور اُسے اس طرح دیکھنے لگی جیسے اسے اپنی نظروں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"ہاں، میں"

وہ دوڑتی ہوئی آئی اور اس کے قدموں کو چھو لیا "چھوٹے جوت دار تم آ گئے ؟"

وہ خوشی اور حیرت سے کانپنے لگی۔ اس نے اس کے بازوؤں کو تھام لیا اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا اور پھر وہ فرطِ جذبات سے رونے لگی۔

"چھوٹے جوت دار سب ختم ہو گیا، سب کچھ ختم، تم نے آنے میں دیر کر دی"

اس نے بے اختیار حلیمہ کو اپنی باہوں میں لے لیا اور اُسے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ وہ پرائی عورت ہے۔ وہ اس کے سینے سے لگی زار و قطار روتی رہی اور وہ اس کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں، جیسے وہ عمر بھر کے ضبط کیے ہوئے آنسو کو اسی لمحے بہا دینا چاہتی ہو اور وہ جب جی بھر کر رو چکی تو اس نے خود کو اس کی باہوں سے الگ کر لیا اور اسے سہارا دے کر اندر کے کمرے میں لے گئی۔

حویلی کے سارے کمرے بند تھے۔ اس نے استعمال کے لیے صرف اس کا کمرہ کھلا رکھا تھا جس میں وہ روز یہ سوچ کر چراغ جلاتی کہ شاید وہ کسی روز واپس آ جائے۔ اس امید میں اُس نے برسہا برس گزار دیئے۔ اس دوران اس کی شادی ہوئی۔ وہ دلہن بن کر پڑوس کے گاؤں لکشمی کانتا پور بھی گئی۔ وہ ماں بھی بنی۔ سب کچھ ہوا، پھر سب کچھ اجڑ گیا۔ ایک دفعہ برسات کے موسم میں اتنا شدید طوفان اور سیلاب آیا کہ اس کا شوہر، اس کا بچہ، اس کا بھائی، اس کا گھر بار سب کچھ بہہ گیا۔ بس وہ کسی طرح موت کے منہ سے واپس آ گئی۔ اور اسے بڑے جوت دار نے پرانے ناتے کی بنا پر اپنے ہاں پناہ دی۔ وہ اس کے بعد سے یہیں رہی۔ اس نے بڑے جوت دار کی آخری دنوں میں بڑی خدمت کی۔ تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا۔ بڑے جوت دار نے آخری لمحوں میں اس سے یہ وعدہ بھی لیا کہ جب تک وہ گھر واپس نہیں لوٹے گا، وہ یہیں رہے گی کہیں نہیں جائے گی۔

اس نے رو رو کر اسے اپنی ساری بپتا سنائی اور وہ بڑے غور سے اس کی ایک ایک بات

سُنتا رہا۔

اس نے بھی سراب کی تلاش میں زندگی کے بہترین مہ و سال گزار دئے تھے اور زندگی کے آخری لمحوں میں ناکام و نامراد لوٹا تھا۔ اس نے دل میں عہد کیا۔ وہ ایک بار پھر نئے سرے سے زندگی شروع کرے گا۔

اس نے قدموں کے قریب بیٹھی ہوئی حلیمہ کو بازوؤں سے پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا اور اس کے دونوں گالوں کو اپنی ہتھیلیوں میں لے لیا۔

(۲۲ر دسمبر ۱۹۸۳ء)

سزا

آج وہ پھر اس کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔

مجسٹریٹ نے اسے دیکھتے ہی فوراً پہچان لیا۔ وہ پہلے سے کافی بدل چکی تھی۔ جسم پہلے سے زیادہ لاغر ہو چکا تھا اور آنکھیں اندر کی جانب دھنس گئی تھیں۔ چہرے کی زردی اور روکھے پن سے اس کی عمر صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اُداسی کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے لیکن اُس کی آنکھوں سے ایک آہنی عزم جھلک رہا تھا جیسے وہ اس دنیا میں ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

اُس نے اس کے چہرے کی جانب غور سے دیکھا۔ وہ پچیس ۲۵ کے پیٹے میں قدم رکھ چکی تھی۔ اس کے باوجود اُس کے چہرے کے نقوش اب بھی تیکھے اور پُرکشش تھے لیکن اس کے چہرے کی تابانی اور جسم کی رعنائی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا "یہ عورت کس قدر بدل چکی ہے۔ تین سال کے عرصے میں اُس کا سب کچھ لٹ چکا ہے جیسے زندگی نے اس سے چُن چُن کر انتقام لیا ہو۔"

اب اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے اور وہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔ اس نے اس کے بارے میں سوچا اور اُسے آج سے تین سال قبل کی رقیہ یاد آ گئی۔ وہ جب پہلی بار اس کے سامنے پیش کی گئی تھی تو اس میں بلا کی دلکشی تھی۔ اس کے چہرے پر گلوں کی سی شگفتگی اور تازگی تھی مگر اس نے اِس دفعہ متوسط طبقے کی بنگالیوں جیسی ساری باندھ رکھی تھی اور شکل و شباہت اور پہناوے سے وہ قطعی گھریلو عورت لگ رہی تھی جیسے وہ ابھی ابھی سیدھے "پاک گھر" سے عدالت میں چلی آئی ہو۔

وہ اس عورت کے ماضی سے اچھی طرح واقف تھا اور اس کی پوری زندگی اس کے سامنے کھُلی ہوئی کتاب کے مانند تھی۔ وہ جہاں سے چاہتا اُسے پڑھ سکتا تھا۔ اس نے اس سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ اسی لیے وہ اس کی سادگی اور مظلومیت سے بہت متاثر تھا اور شاید اسی لیے اس نے رقیہؔ کی تمام باتیں یاد رکھی تھیں ورنہ ایک مجسٹریٹ کو زندگی میں سیکڑوں ملزموں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ہزاروں مقدموں کے فیصلے سنانے پڑتے ہیں۔ بہت کم مقدمے اور ملزم ایسے ہوتے ہیں جو انھیں یاد رہتے ہیں، لیکن اسے رقیہؔ کی تمام باتیں یاد تھیں۔ تمام تفصیلات کا علم تھا، جیسے اُس نے ابھی ابھی اپنی داستان سنائی ہو۔

وہ چند لمحوں کے لیے اپنے خیالات میں گُم ہو گیا اور اسے رقیہؔ کی بتائی ہوئی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔

وہ ضلع میمن سنگھ کے روپ پور تھانے کے ایک دور افتادہ گاؤں ویجئے نگر کی رہنے والی تھی۔ احمد علی بھی اسی گاؤں سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے گھرانے سے اس کا دیرینہ تعلق تھا۔

رقیہ کا باپ عبدالسبحان جب تک زندہ رہا، احمد علی اس کی زمین پر بھاگے داری میں کھیتی کرتا رہا کیوں کہ اب وہ کافی ضعیف ہو چکا تھا اور اس میں تنہا سارے کھیت کو چاش کرنے کی قوت نہیں رہی تھی۔ برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا اور وقت ہاتھ سے نکلتا جا رہا تھا۔ پھر عبدالسبحان چند دنوں سے بیمار بھی رہنے لگا تھا۔

اس کے سینے میں ہلکا ہلکا درد رہتا اور وہ ہمیشہ کھانستا رہتا۔ ان حالات میں مکر بھر پانی میں اُتر کر صبح سے شام تک پٹ سن کے پودے لگانا اور پودے کے بڑے اور سنہرے ہو جانے پر اُسے کاٹ کر خشکی پر سکھانا، اب اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ اِن تمام مجبوریوں کی وجہ سے سبحان میاں نے اُسے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ شرط یہ تھی کہ جب پٹ سن اور دھان کی فصل کٹے گی تو وہ آپس میں آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔ سبحان میاں کا سوائے رقیہ کے دنیا میں کوئی نہیں تھا اور سال بھر کی محنت و مشقت کے بعد جو فصل پیدا ہوتی تھی وہ دونوں باپ اور بیٹی کے لیے کافی تھی۔ چنانچہ فصل کا نصف حصہ بھاگے دار کو دینے پر بھی انھیں کوئی کمی نہیں ہوتی تھی، اور سال بھر کھیتوں، ندی نالوں اور ریلوے لائن کی دونوں جانب کٹی ہوئی زمینوں میں جمع شدہ پانی میں مچھلیاں پکڑ کر اور نمک مرچ سے پنتھا بھات کھا کر اُن کا بڑے آرام اور اطمینان سے گزارا ہو جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی پُوٹی اور بیلیا مچھلیاں اور جنگڑیاں کھیتوں کے منڈیروں کے درمیان لگائی ہوئی بانس کی چائی میں خود بخود پھنس جایا کرتی تھیں جنھیں سبحان میاں عموماً شام کو گھر لوٹتے وقت ایک چھوٹی سی ٹوکری میں اکٹھی کر کے لے آیا کرتا تھا اور جسے رقیہ بڑے شوق سے سرسوں کے تیل اور گرم مسالے میں بھاج لیا کرتی تھی۔ اگر کھیتوں میں پانی خشک ہو جاتا تو وہ جال لے کر تالابوں یا پھر اپنے کھیت کے قریب سے بہنے والی میگھنا ندی پر جاتا اور جال پھینک کر دو چار مچھلیاں ضرور پکڑ لاتا۔ اِن مچھلیوں میں ایلش ضرور ہوتی جو اس کی سب سے پسندیدہ مچھلی تھی، اور جس کا جھول وہ بڑی رغبت سے کھاتا تھا۔ سبحان میاں کے بیمار ہونے کی صورت میں رقیہ خود ہاتھ میں پُوکو (ٹاپا سے ملتی جلتی بانس کی شہتروں سے بنی ہوئی شے، جس سے مچھلیوں کا شکار کیا

جاتا ہے) اور گچھالے کر مچھلیاں پکڑنے نکل پڑتی لیکن وہ ندی یا نالے میں جانے کے بجائے سیدھی ریلوے لائن کی دونوں جانب کٹی ہوئی زمینوں میں پہنچ جاتی، جہاں بارش کا پانی جمع ہو جانے کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے مصنوعی تالاب بن جایا کرتے تھے۔ اِن مصنوعی تالابوں میں وہ پُولو کی مدد سے بڑی آسانی سے بام مچھلیاں پکڑ لاتی تھی جو عموماً کیچڑ کے اندر چھپی رہتی تھیں۔ انھیں کھانے پینے کی چیزوں میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی تھی۔ دھان سے لے کر ساگ سبزی اور مختلف قسم کی دالیں اور ترکاریاں اور گڑ تک وہ خود ہی پیدا کر لیا کرتے تھے۔ البتہ انھیں کراسن اور سرسوں تیل اور کپڑوں کے لیے نقد روپوں کی ضرورت ہوتی تھی، جو وہ پٹ سن اور فاضل دھان بیچ کر حاصل کر لیا کرتے تھے۔

سبحان میاں کو اب رقیہؔ کی شادی کی فکر ستانے لگی تھی، کیوں کہ رقیہؔ بڑی تیزی سے سیانی ہو رہی تھی اور اس کا قد اس کی عمر سے زیادہ نکل آیا تھا اور اب وہ سبحان میاں اور احمد علی کے سامنے بڑی احتیاط سے ساری پہننے لگی تھی۔ اس میں اب شرم و حیا کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جب بھی سبحان میاں یا احمد علی کے سامنے آتی، سر پر ساری کا آنچل کھینچ لیتی اور نظریں جھکا کر بڑی آہستگی اور نرمی سے باتیں کرتی، جیسے اس میں اپنے جوان ہونے کا خود بخود احساس پیدا ہو گیا ہو۔ سبحان میاں بھی اُس کی اِن تبدیلیوں کو محسوس کرنے لگا تھا چنانچہ اُس کی نظریں رقیہؔ کے لیے مناسب بَر کی تلاش کرنے لگی تھیں اور اس کی نظریں تلاش کرتے کرتے احمد علی پر رُک گئی تھیں۔

وہ احمد علی کے باپ محمد علی کو اچھی طرح جانتا تھا، جو کبھی اُس کے کھیت کی بغل والی زمین پر کاشت کیا کرتا تھا۔ وہ زمین محمد علی کی تھی، لیکن مہاجن کا پُرانا قرض ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے اُس کی زمین قرق ہو گئی، اور محمد علی بھی احمد علی کی طرح کھیت مزدور بن گیا اور دور دراز کے دیہات میں گزر اوقات کے لیے دوسروں کی زمین پر کاشت کرنے لگا۔ احمد علی کے باپ کا گزشتہ سال ہی انتقال ہوا تھا۔ جب سبحان میاں کو معلوم ہوا تو اس نے احمد علی کو اپنے کھیت میں کام کرنے کے لیے رکھ لیا۔ اِس کے پیچھے دو مقاصد تھے۔ اوّل یہ کہ وہ کھیتی باڑی میں اس کی مدد کرے۔ دوم یہ کہ اگر

احمد علی کو رقیہؓ پسند ہوا اور وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہو تو وہ رقیہؓ کے ہاتھ پیلے کر دے۔

احمد علی جب اُس کے کھیت پر کام کرنے لگا تو اس کے کھانے پینے اور رہنے کا سبحان میاں کے گھر پر انتظام ہو گیا کیوں کہ احمد علی کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ وہ عموماً دونوں وقت سبحان کے ساتھ کھانا کھاتا اور اُسے رات کو الگ ایک چھوٹی سی کٹیا میں سونا پڑتا، جو سبحان میاں کی جھونپڑی کے قریب ہی تھی اور جس کی بغل میں گائے اور بکریوں کا بیڑا تھا۔

رقیہؓ نے جب پہلی بار احمد علی کو دیکھا تو وہ قدرے شرمائی۔ اپنی سفید دبیز ساری میں جسم کو سکیڑ لیا اور نصف گز کا گھونگھٹ نکال کر ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ سبحان میاں اور احمد علی اوسارے میں پیڑھے پر بیٹھے کھانے کا انتظار کرتے رہے۔ سبحان میاں نے جب رقیہ کو احمد علی کے سامنے جھجکتے ہوئے دیکھا تو کہا "رقیہ! تو کس سے شرما رہی ہے؟ یہ تو تیرے بچپن کا ساتھی احمد علی ہے۔ محمد علی کا بیٹا، تو اِسے پہچانا نہیں؟"

رقیہؓ نے احمد علی کی جانب نظر بھر کر دیکھا اور احمد علی نے رقیہؓ کی جانب۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔

"رقیہؓ کتنی بڑی ہو گئی ہے اور کتنی خوبصورت بھی، حالانکہ وہ چند سال قبل اُسے چانٹے لگایا کرتا تھا۔"

اس نے دل ہی دل میں سوچا اور رقیہؓ کی جانب دُزدیدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ رقیہؓ اُس کی مشتاق نظروں سے بے خبر سر جھکائے ان کی کانسی کی تھالیوں میں دال بھات اور مچھلی کا گھونٹا انڈھیلتی رہی اور کھانا دینے کے بعد چولہے کے قریب بیٹھی اُنھیں کھاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

رقیہؓ دور بیٹھی احمد علی کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ احمد علی بھی گبھرو جوان بن چکا تھا اور اس کے سیاہ اور چوڑے سینے پر بڑے بڑے بال نکل آئے تھے۔ وہ اس سے عمر میں سات آٹھ سال بڑا تھا اس لیے وہ اسے بچپن میں عموماً پیٹا کرتا تھا اور وہ اُس سے مار کھانے کے بعد اُس کے ابّو محمد علی سے شکایت کیا کرتی تھی۔

دو چار دنوں کے بعد اُن کے درمیان شرم اور جھجک دور ہو گئی اور وہ آپس میں کھل کر باتیں کرنے لگے۔ احمد علی جاڑے میں صبح تڑکے اٹھتا اور سبحان میاں کے بیدار ہونے سے قبل ہی چپکے سے ہل شانے پر اٹھائے، بیلوں کو ہانکتا ہوا کھیت کی جانب روانہ ہو جاتا اور جب رقیہ مرغ کی بانگ سُن کر اٹھتی اور بکریوں، مرغیوں اور بطخوں کو ان کے ڈربوں سے نکالنے کے بعد احمد علی کو جگانے کے لیے اس کی کٹیا میں جاتی تو اُسے خالی پاتی۔ سبحان میاں کے بیدار ہونے کے بعد منہ ہاتھ دھو کر دیگر ضروریات سے فارغ ہوتے ہی وہ اس کے سامنے پانتھا[1] بھات کی تھالی رکھ دیتی اور ساتھ ہی نمک پیاز اور ہری مرچ بھی۔ سبحان میاں کے کھیت پر جاتے ہی احمد علی بھات کھانے کے لیے گھر لوٹ آتا اور رقیہ اس کے سامنے بھی یہی کچھ رکھ دیتی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی پنکھا جھلتے ہوئے مکھیاں اڑاتی اور اس سے سارے جہان کی باتیں کرتی رہتی۔

ایک دن وہ جب اسی طرح بیٹھی احمد علی کو کھانا کھلا رہی تھی۔ اس نے اُسے چھوٹی چھوٹی سیپیوں سے بنی ہوئی ایک مالا اور سنکھ کی بنی ہوئی چوڑیاں دیں جو اس نے حاجی پیر کے عرس کے موقع پر خاص رقیہ کے لیے خریدی تھیں۔ پہلے تو وہ اُسے قبول کرتے ہوئے ہچکچاتی رہی، لیکن جب احمد علی کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو اس نے اُسے قبول کر لیا اور شرما کر جھونپڑی کے اندر بھاگ گئی۔ شام کو جب احمد علی کھیت سے واپس آیا تو وہ ہار رقیہ کے گلے میں اور چوڑیاں اُس کی

---

[1] بنگال میں رات کو پکے ہوئے باسی چاول میں پانی ڈال کر رکھ دیا جاتا ہے، جسے دوسرے دن صبح کو ناشتے میں کھایا جاتا ہے۔

کلائیوں میں تھیں۔ اُس نے بالوں میں بہت سارا سستا خوشبودار تیل ڈال کر بڑا سا کھوپا[1] باندھ رکھا تھا۔ احمد علی نے دیکھا، اُس کی آنکھوں میں گہری کاجل چمک رہی تھی، ہونٹوں پر مسکراہٹیں مسلسل رقصاں تھیں اور اُس کے دونوں پاؤں آلتا[2] سے رنگے ہوئے تھے۔

احمد علی کی طرح سبحان میاں کو بھی رقیہؔ میں زبردست تبدیلی نظر آئی، وہ خاموشی سے رقیہؔ کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا اور اس نے دوسرے ہی دن کھیت پر احمد علی سے تمام باتیں معلوم کرلیں۔ احمد علی کی جانب سے رضامندی ظاہر کرتے ہی وہ گاؤں کے موڑل[3] اظہار الدین اور دوسرے سرکردہ لوگوں سے صلاح و مشورہ کرنے کے لیے چلا گیا اور واپسی میں گاؤں کی مسجد کے امام صاحب سے شادی کی تاریخ اور وقت طے کرآیا۔ اُن دونوں کی شادی میں سبحان میاں اور امام صاحب کے علاوہ گاؤں کے پانچ بڑوں نے شرکت کی اور شادی کے بعد سبحان میاں خود احمد علی کی چھوٹی سی کٹیا میں منتقل ہوگیا۔

دن تیزی سے گزرنے لگے اور احمد علی شادی کے بعد پہلے سے زیادہ محنت کرنے لگا۔ شادی کے بعد سبحان میاں کی طبیعت مستقل خراب رہنے لگی اور ضعیفی، نقاہت اور گٹھیا کی وجہ سے وہ تقریباً بستر سے لگ گیا۔ احمد علی اب کاشتکاری کا تمام کام خود ہی کرنے لگا۔ سبحان میاں دن بھر اپنی کٹیا میں لیٹا یا تو گٹھیا کی وجہ سے کراہتا رہتا یا پھر طبیعت قدرے اچھی رہتی تو دالان[4] میں بیٹھا دھوپ تاپتے ہوئے ناریل کا حقہ پیتا رہتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے کئی ماہ گزر گئے اور احمد علی کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا۔ رات کے آخری پہر

---

[1] جوڑا

[2] آلتا۔ دونوں پاؤں میں سُرخ رنگ لگانا۔

[3] سردار، چودھری

[4] صحن

میں رقیہؔ کو دردِ زہ شروع ہوا اور احمد علی لالٹین لے کے گاؤں کے بالکل آخری سرے پر رحیمہ خالہ کو بُلا لایا، جو بچّہ جنوانے میں بڑی مہارت اور شہرت رکھتی تھی، لیکن رحیمہ خالہ جب پہنچی تو اس کی جھونپڑی میں نومولود بچّے کی چیخ گونج رہی تھی۔

سبحان میاں اپنے ننھّے نواسے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اسے گود میں لے کر خوب پیار کرتا رہا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی جو اس نے مرنے سے قبل اپنے نواسے کو گود میں کھلایا۔ پھر دو سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ احمد علی کے ہاں دوسرا بچّہ ہوا لیکن سبحان میاں اپنے دوسرے نواسے کو نہ دیکھ سکا اور چند دنوں کی علالت کے بعد اچانک چل بسا۔ رقیہؔ باپ کی لاش سے لپٹ کر روتی اور سینہ کوبی کرتی رہی، لیکن صبر و تحمّل کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ سو وہ رو دھو کر خاموش ہو گئی اور سبحان میاں کو اس کی جھونپڑی کے قریب بانسوں کے جھنڈ میں دفن کر دیا گیا، لیکن سبحان میاں کے انتقال کے بعد جیسے رقیہؔ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

بارش کا موسم شروع ہوتے ہی ندیوں اور نالوں میں پانی بھر گیا اور موسلا دھار بارش کی وجہ سے ندیوں کے پانی کی سطح بلند ہونے لگی اور ایک دن یہ سطح خطرے کے نشان کو بھی پار کر گئی اور ہر جانب پانی ہی پانی نظر آنے لگا اور کھیت کھمار، پیڑ، پودے اور گھر بار سب کچھ پانی میں غرق ہو گیا۔ سیلاب کے دھارے سے کھڑی فصل اور اناج کے ذخیروں کے علاوہ مویشی بھی بڑی تعداد میں بہہ گئے۔ اس کی جھونپڑی قدرے بلندی پر تھی اس لیے سیلاب میں بہہ تو نہیں گئی، البتہ سائیکلون نے اُسے بہت نقصان پہنچایا اور اس کی جھونپڑی کئی جگہوں سے ٹوٹ پھوٹ گئی۔ سیلاب کی وجہ سے اُس کی جھونپڑی کی شکل ایک چھوٹے سے جزیرے کی سی ہو گئی، جس کی چاروں جانب تاحدِ نظر پانی ہی پانی تھا۔ سیلاب کا پانی جتنی تیزی سے بڑھ رہا تھا اُس کی وجہ سے جھونپڑی میں رہنا خطرے سے خالی نہ تھا خصوصاً رات کو اچانک پانی کی سطح بلند ہو جانے اور جھونپڑی کے ڈوب جانے کا خطرہ تھا۔ چنانچہ رقیہؔ اور احمد علی نے اپنے بچّوں کے ساتھ کشتی میں پناہ لی اور تین دن اور تین راتیں کشتی پر بسر کرنے کے بعد ملٹری کی ریسکیو پارٹی نے انھیں قریب کے ایک ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دیا، جو بلندی

پر ہونے کی وجہ سے ابھی تک سیلاب سے محفوظ تھا۔ وہاں ان کے علاوہ سیکڑوں افراد پناہ گزیں تھے اور ان کی تعداد میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

رقیہؔ اور احمد علی کئی ہفتے اسٹیشن پر رہے اور ریلیف میں ملنے والی دال اور چاول سے پیٹ کا دوزخ بھرتے رہے۔ انھیں سیلاب کا پانی اترنے کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا تاکہ وہ اپنے گاؤں واپس جا کر اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کی مرمت کر سکیں اور قدرت سے ایک بار پھر برسرِ پیکار ہونے کے لیے کمر باندھ سکیں۔ طویل انتظار اور بے چین راتیں گزارنے کے بعد جب سیلاب کا پانی اُترا تو سب کچھ اپنی جگہ موجود تھا۔ سیلاب زدہ لوگوں نے ریلیف کے پیسے سے اپنی جھونپڑیوں کی پھر سے مرمّت اور مویشیوں اور دھان کی خریداری شروع کر دی اور اُجڑے ہوئے کسانوں کی زندگی معمول پر آ گئی تھی لیکن رقیہؔ اور احمد علی کا سب کچھ لٹ چکا تھا اور قیامت خیز سیلاب میں ندی کا رُخ بدل جانے کی وجہ سے اس کی جھونپڑی اور کھیت دریا بُرد ہو چکے تھے اور جس زمین پر احمد علی کاشت کرتا تھا وہاں چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیاں چل رہی تھیں اور مستقبل تاریک اور مایوس کن نظر آنے لگا تھا۔

اپنے حلقے کی یونین کونسل کے چیئرمین سے منتیں کرنے اور ریلیف آفیسر کی خوشامدیں کرنے پر انھیں ریلیف کے طور پر کچھ نقد روپے تو مل گئے لیکن کوئی انھیں زمین دینے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ وہ چند روز تک ریلیف کے روپے استعمال کرتے رہے پھر روزگار کے لیے احمد علی کو ڈھاکہ آنا پڑا اور اُس کے ساتھ رقیہؔ کو بھی۔

ڈھاکہ آنے کے بعد وہ چند روز پرانے ڈھاکے کے ریلوے پلیٹ فارم پر ٹین کے شیڈ کے نیچے پناہ گزیں رہے، لیکن جب ریلوے پولیس نے انھیں وہاں سے نکال دیا تو وہ بیت المکرم کے سامنے خیمہ زن ہوئے اور احمد علی روزگار کی تلاش میں مارا مارا پھرنے لگا۔ ایک ہمدرد شخص کی کوششوں سے اُسے آدم جی جوٹ ملز میں کام مل گیا اور وہ وہاں مزدور کی حیثیت سے کام کرنے لگا اور رقیہؔ کو آدم جی نگر لے گیا، جہاں اُسے کارخانے کی جانب سے برائے نام کرائے پر کوارٹر مل گیا۔

احمد علی چند دنوں میں مِل کا ہوشیار اور ہنر مند مزدور بن گیا اور پیداوار کے مطابق اس کی اُجرت میں بھی اضافہ ہونے لگا اور اس کی مزدوری اسّی روپے سے بڑھ کر سوا اور سوا سو روپے تک پہنچ گئی۔ شہر میں آنے اور طرزِ زندگی بدل جانے کی وجہ سے احمد علی اور رقیّہ میں بھی غیر شعوری تبدیلیاں رونما ہونے لگیں اور احمد علی آہستہ آہستہ دوسرے مزدوروں کے رنگ میں رنگ گیا۔

اس میں جو پہلی نمایاں تبدیلی نظر آئی وہ یہ کہ اس نے ناریل کے حقّے کی جگہ بگلا سگریٹ پینا شروع کر دیا اور تنخواہ ملتے ہی فٹ پاتھ پر سے رقیّہ کے لیے سُرخ چھینٹ کا ریڈی میڈ بلاؤز خرید لایا۔ اس کی منطق یہ تھی کہ شہر میں عورتیں ساری کے ساتھ بلاؤز بھی پہنتی ہیں جب کہ رقیّہ صرف ساری پہنتی ہے جس سے اس کے جسم کا حصّہ صاف نظر آتا رہتا ہے۔ اس میں دوسری نمایاں تبدیلی یہ نظر آئی کہ وہ ایک دن فٹ پاتھ پر سے رقیّہ کے لیے سستا خوشبودار تیل اور پاؤڈر خرید لایا۔ اس کی خواہش تھی کہ رقیہ بھی دوسرے مزدوروں کی بیویوں کی طرح بناؤ سنگھار کرے اور وہ جب شام کو گھر لوٹے تو وہ بھی سج دھج کر اس کا استقبال کرے۔ رقیّہ کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی اور دو بچّوں کی ماں ہونے کے باوجود جوان اور پُرکشش تھی۔ اس کے اصرار کرنے پر اس نے بلاؤز کے اندر بریسیری بھی پہننا شروع کر دی۔ اس کا کہنا تھا کہ بریسیری پہننے سے عورت کی خوبصورتی اور بھی نکھر آتی ہے اور وہ پہلے سے زیادہ اچھی لگنے لگتی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جب سے اس نے بریسیری پہننا شروع کیا تھا اُس کا حُسن اور بھی نکھر آیا تھا اور اس میں بلا کی کشش پیدا ہو گئی تھی۔ رقیّہ کو احمد علی کی کسی بات پر اعتراض نہ تھا۔ وہ تو صرف یہ چاہتی تھی کہ احمد علی اُس سے خوش رہے اور اُس سے زیادہ سے زیادہ محبّت کرے۔ وہ احمد علی کے ہر حکم کی تعمیل کرتی تھی، کیوں کہ وہ اُس کی ہر بات اور ہر ادا پر فدا تھی۔

اب احمد علی ہر اتوار کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ سینما دیکھنے لگا تھا اور خود دیکھنے کے علاوہ اُسے بھی کبھی کبھی اپنے ساتھ لے جانے لگا تھا۔ اس نے رقیّہ کو پہلی جو فلم دکھائی وہ "روپ

جان" تھی، جس کی کہانی اُس نے بچپن میں اپنی ماں سے سُنی تھی۔ احمد علی کی طرح رقیہؔ پر بھی شہری تہذیب کا اثر پڑنے لگا تھا اور وہ بھی دوسرے مزدوروں کی بیویوں کے رہن سہن اور اُن کے ڈھنگ سے متاثر ہونے لگی تھی۔

اس کے بڑے بیٹے شوتّار (ستّار) کی عمر پانچ سال ہو چکی تھی اور اب رقیہ بھی دوسرے مزدوروں کے بچّوں کے ساتھ اُسے اسکول بھیجنے لگی تھی۔ کمپنی نے مزدوروں کے بچّوں کے لیے کالونی کے اندر خاص طور پر اسکول کھول رکھا تھا، جہاں تعلیم اور کتابیں مفت فراہم کی جاتی تھیں۔ رقیہؔ نے شوتّار کے لیے اسکول کے دو یونیفارم سلوا دیے تھے جنھیں وہ باری باری استعمال کرتا تھا۔

پہلے روز جب شوتّار اسکول گیا تو رقیہؔ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے علی الصبح اُٹھتے ہی شوتّار کو اپنے ہاتھوں سے نہلایا۔ اس کے کپڑے بدلے اور اسے بنا سنوار کر اسکول بھیجا۔ اس روز رقیہؔ دن بھر بہت خوش و بشاش رہی اور حسین مستقبل کا خواب دیکھتی رہی۔ اسے یقین تھا کہ اس کا بیٹا ایک دن پڑھ لکھ کر ضرور بڑا افسر بنے گا اور ساری مصیبتیں دور ہو جائیں گی۔ وہ اپنی موجودہ زندگی سے بہت خوش تھی۔ اس نے اپنے ماضی کو تقریباً بھلا دیا تھا اور اب اسے اپنا گاؤں چھُٹنے اور زمین کے ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس نہیں رہا تھا۔ وہ نئی زندگی سے خوش تھی اور نئے ماحول اور معاشرے میں ڈھل چکی تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ اس کے خوابوں کا محل اچانک مسمار ہو گیا۔

احمد علی کو مِل میں کام کرتے ہوئے چار سال ہی ہوئے تھے کہ ایک دن وہ اچانک حادثے کا شکار ہو گیا۔ آہنی دیو نے اس کے دونوں ہاتھوں کو دبوچ لیا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ سارے کارخانے میں کہرام مچ گیا اور اسے نازک حالت میں مِل کے اسپتال میں داخل کیا گیا۔

رقیہؔ کو جب اِس کی اطلاع ملی تو وہ غش کھا کر گر پڑی اور جب ہوش آیا تو وہ روتے پیٹتے اسپتال پہنچی اور احمد علی کے پاؤں سے لپٹ کر زار و قطار روتی رہی۔ وہ اسپتال میں کئی ماہ زیرِ

علاج رہا اور اپنی دونوں کلائیوں سے محروم ہو گیا۔

احمد علی اس حادثے کو اپنی تقدیر کا لکھا اور پُرکھوں کے گناہوں کی سزا سمجھ کر خاموش رہ گیا، اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔

رقیہؔ کی پُرسکون دنیا لُٹ چکی تھی۔ وہ بھی رو دھو کر خاموش ہو گئی۔

اس نے محسوس کیا کہ اُس کے رونے سے احمد علی کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ بہت زیادہ بے چین ہو جاتا ہے۔ اُس نے اپنے غم اور آنسوؤں کو پی لیا اور اس میں آہستہ آہستہ عزم اور استقلال پیدا ہونے لگا۔

جب سے حادثہ پیش آیا تھا، احمد علی خاموش سا رہنے لگا تھا اُسے اس کا شدید احساس تھا کہ وہ رقیہؔ کی مدد کرنے کے بجائے اس پر بوجھ بنتا جا رہا ہے۔ رقیہؔ کو اُس کے دلی جذبات کا احساس تھا اِس لیے وہ ہمیشہ اُسے دلاسا دیتی اور اُس کے حوصلے بڑھاتی رہتی۔ احمد علی کے معذور ہو جانے کے بعد سے وہ اس سے پہلے سے زیادہ محبّت کرنے لگی تھی اس میں بڑا عزم اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی اور وہ احمد علی اور اپنے بچّوں کے لیے ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔

اُس نے اِس حادثے کے بعد بھی شوتّار کی تعلیم جاری رکھی اور اُسے اسکول بھیجتی رہی۔ شوتّار اس کا سب سے بڑا سہارا تھا، اور جب سے احمد علی حادثے کا شکار ہوا تھا، وہ اِس چھوٹی سی جان سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کرنے لگی تھی۔

یونین کی کوششوں سے اُسے دو ہزار روپے ہرجانہ اور پروویڈینٹ فنڈ کے روپے ملے اور اُسے آدم جی کالونی سے اُٹھ کر لال چند مقیم لین کی بوسیدہ اور تاریک عمارت میں پناہ لینی پڑی۔ اب وہ کمپنی کا مزدور نہیں تھا اس لیے اسے کالونی میں رہنے کا حق بھی نہیں تھا۔ احمد علی کو کالونی چھوڑتے ہوئے بڑا دکھ ہوا۔ اُس نے وہاں اپنی نئی زندگی شروع کی تھی لیکن کالونی چھوڑے بِنا چارہ بھی نہ تھا۔

پُرانے ڈھاکے میں آنے کے بعد اس نے سب سے پہلے شوتّار کو قریب کے ایک اسکول میں داخل کر دیا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ احمد علی کے حادثے کے نتیجے میں شوتّار کی تعلیم منقطع ہو جائے اور وہ محلّے کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ سڑکوں پر مارا مارا پھرے۔

رقیہؔ شوتّار کی تعلیم کا خاص خیال رکھتی تھی اور اُسے کبھی بھی اسکول سے ناغہ نہ ہونے دیتی تھی۔ وہ شوتّار کو اسکول بھیجنے اور گھر کے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد احمد علی کی دلجوئی کرتی اور اُسے ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتی۔ اب وہ کھانے پینے اور دیگر ضروریات کے لیے رقیہؔ کا محتاج تھا۔ وہ جب بھی اُس کے بارے میں سوچتی، اُس کا دل پیار کے جذبات سے بھر آتا۔ احمد علی بھی اب اُس کی محبّت اور اُس کی گداز باہوں میں زیادہ راحت محسوس کرنے لگا تھا۔

پرووی ڈینٹ فنڈ میں احمد علی کو جو روپے ملے، اُس سے ایک سال بڑے اطمینان سے گزارا ہوا، لیکن دوسرے سال رقیہؔ کے لیے بڑے پریشان کُن حالات پیدا ہو گئے اس لیے کہ اب روزگار کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ دوسری جانب اخراجات پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ گئے۔ جس کی وجہ سے رقیہ بہت پریشان اور فکر مند رہنے لگی۔ اُس کے پاس جوں جوں روپے کم ہوتے گئے، اُس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ اُس نے احمد علی پر اپنی پریشانی ظاہر ہونے نہیں دی، لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے اس کی راتوں کی نیند حرام ہوتی گئی۔ وہ ہر وقت روزگار کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس نے پاس پڑوس کی عورتوں کو بھی اپنے لیے کوئی کام تلاش کرنے کے لیے کہہ رکھا تھا۔

ایک دن اس کی پڑوسن رحیمہ نے اسے بتایا کہ اس کے شوہر غفور نے اس کے لیے اسکاٹن کے ایک ہوٹل کے مینیجر کے گھر پر آیا کی ملازمت ٹھیک کر دی ہے، جہاں اُسے ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ ملے گی۔

غفور اس ہوٹل میں بیرا تھا اور اُس نے رقیہؔ کی پریشانی دیکھ کر یہ ملازمت ٹھیک کر دی تھی۔ رقیہؔ ملازمت کی خبر سُن کر بہت خوش ہوئی اور اس کے لیے فوراً تیار ہو گئی۔ احمد علی نے اپنی مجبوری کے پیشِ نظر اُسے ملازمت کرنے کی اجازت دے دی اور وہ دوسرے دن غفور کے ساتھ

ہوٹل روانہ ہوگئی۔

وہ جب رات آٹھ بجے گھر لوٹی تو اُس کے چہرے پر گہری افسردگی چھائی ہوئی تھی اور آنکھیں بہت زیادہ رونے کی وجہ سے سوج چکی تھیں۔ شوتّار اور نوبی سو چکے تھے اور احمد علی بستر پر لیٹا اس کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

رقیہؔ جھونپڑی میں داخل ہوتے ہی اس کے سینے پر گر کر زار و قطار رونے لگی اور روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اُس نے کچھ بھی نہیں کہا، لیکن وہ سب کچھ سمجھ گیا اور اُسے سینے سے لگا کر پیار کرتا رہا۔ اُس کی ساری کے پلّو میں بیس روپے بندھے ہوئے تھے۔

اور پھر اس واقعے کو بہت دن بیت گئے۔

رقیہؔ کے دل میں یہ واقعہ ناسور کی طرح رِستا رہا اور وہ اُسے ایک ہیبت ناک خواب سمجھ کر بھلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کی جمع شدہ پونجی آہستہ آہستہ ختم ہوگئی اور نیم فاقہ کشی کی نوبت آگئی۔ پہلے تو وہ گھر کا چھوٹا موٹا سامان بیچ کر گزارا کرتی رہی، لیکن جب وہ بھی ختم ہوگیا تو فاقہ کشی شروع ہوگئی۔ رقیہؔ اور احمد علی نے تو کسی حد تک اپنے پیٹ پر پتّھر باندھ لیا۔ لیکن شوتّار اور نوبی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انھیں تو بھات چاہیے، خواہ جہاں سے بھی آئے۔ بھوک سے جب بچّوں کی آہ و بکا حد سے بڑھ گئی اور اس سے بچّوں کی حالت نہ دیکھی گئی تو اُس نے روتے ہوئے احمد علی سے فیصلہ کن انداز میں کہا "میں ہوٹل جاؤں گی"۔

احمد علی جواب دینے کے بجائے نہایت بے چارگی سے اُس کی جانب دیکھنے لگا، جیسے وہ ماتم کر رہا ہو۔

اور پھر رقیہؔ اور احمد علی نے اِسے بھی نوشتۂ تقدیر سمجھ لیا۔

آج وہ پھر اُس کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔

مجسٹریٹ نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا، اس نے اِس بار بھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی کسی قسم کی پردہ پوشی سے کام نہیں لیا تھا اور نہایت سچّائی سے اعترافِ جرم کر لیا تھا۔ اب صرف مجسٹریٹ کو اپنا فیصلہ سُنانا تھا اور وہ اپنا فیصلہ سُنانے سے قبل ایک بار پھر اس کی کتابِ زندگی کے اوراق اُلٹ پلٹ رہا تھا۔

مجسٹریٹ نے اس سے کہا "جانتی ہو تم کس جرم میں گرفتار کی گئی ہو؟"

"جی ہاں"

"کیا تم اعترافِ جرم کرتی ہو؟"

"جی ہاں!" اس نے مجسٹریٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے وقار اور خود اعتمادی کے ساتھ جواب دیا۔ "میں اعترافِ جرم کرتی ہوں، میرے دو چھوٹے چھوٹے بچّے ہیں۔ میرا شوہر اپاہج ہے۔ میرا بڑا بیٹا ساتویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ قانون مجھے جو سزا دینا چاہے دے سکتا ہے۔"

یوٹوپیا

کھلنا ایکسپریس کے جیسور اسٹیشن میں رُکتے ہی وہ بیوی بچّوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔

اس کے ساتھ وہ لوگ بھی اُتر گئے، جو ڈھاکے سے لانچ پر اُس کے ساتھ آئے تھے اور ساتھ ہی سرحد پار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ پچیس افراد پر مشتمل سات خاندان روفیک دلّال کی قیادت میں ہندوستان جا رہا تھا۔ تمام لوگ اسی مقصد سے صدر گھاٹ سے کھلنا اور پھر کھلنا سے یہاں آئے تھے اور دھڑکتے ہوئے دلوں اور وسوسوں کے ساتھ سات کھیرا جا رہے تھے، جہاں سے لوگ عموماً پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر ہندوستان آتے جاتے رہتے تھے۔ راستہ طویل، تکلیف دہ اور خطرناک تھا اور میلوں پیدل چلنے کے بعد بھی گرفتار کر لیے جانے کا اندیشہ تھا۔ پھر بھی انہوں نے سرحد عبور کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اور اس مقصد کے لیے دلّال کو فی کس ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ ادا کیا تھا۔

ٹرین سے اُترنے کے بعد تمام لوگوں نے اپنے اپنے مال و اسباب کی جانچ پڑتال کی، لوگوں

کو گنا اور تمام چیزیں ٹھیک پا کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس قافلے میں بوڑھے بھی تھے اور بچے بھی۔ جوان بھی تھے اور ادھیڑ عمر کی عورتیں اور مرد بھی۔ ایسے شیر خوار بچے بھی، جو ماں کے سینے سے جونک کی طرح چپکے ہوئے تھے اور ایسے معصوم بچے بھی، جو اپنے نازک کندھوں پر سامان اٹھائے ہوئے تھے۔

ٹرین دوپہر کو ٹھیک بارہ بجے پہنچی تھی اور انھیں شام سے قبل سرحد کے قریب پہنچ جانا تھا۔ رات بھر لائن پر جاگتے رہنے کی وجہ سے تمام لوگ تھکے ہوئے تھے اور انھیں ابھی مزید مسافت طے کرنی تھی، چنانچہ رفیق نے تمام لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ تھوڑی دیر ویٹنگ روم میں آرام کر لیں اور دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو لیں۔ راستے میں انھیں کہیں کھانے پینے کی چیزیں نہیں ملیں گی۔

تمام لوگوں کو ایک بجے بس پر سات کھیرا روانہ ہو جانا تھا، لہٰذا لوگ منھ ہاتھ دھونے، غسل کرنے یا پھر دوپہر کا کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ زیادہ تر لوگ اسٹیشن کے باہر واقع سستے ہوٹلوں سے کھانا لے آئے۔ ریفریشمنٹ روم کا کھانا مہنگا تھا، اور یہ لوگ وہاں جانے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ روانگی کے وقت زینت نے سفر میں کھانے کے لیے کھجور، خورما اور پوستہ دانے کی میٹھی روٹیاں بنالی تھیں۔ اس نے یہ چیزیں پوٹلی سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں۔ اس نے دلّال کو روپے دینے کے لیے اپنے کانوں کے بندے اور چوڑیاں بھی بیچ دی تھیں، اور اب جائے مقصود تک پہنچنے کے لیے اس کے پاس صرف چند روپے رہ گئے تھے۔

ہندوستان پہنچنے کے بعد کیا ہوگا؟ یہ روپے کتنے دن چلیں گے؟ اس کے بعد کس طرح گزارا ہوگا؟ یہ انھیں معلوم نہیں تھا اور نہ انھوں نے اس بارے میں سوچا تھا۔ اس وقت ان کے سامنے صرف ایک مقصد تھا کہ جس طرح بھی ہو ہندوستان پہنچنا ہے۔

ایک بجے سے قبل تمام لوگ بس ٹرمینس کی جانب روانہ ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری بس مسافروں سے بھر گئی۔ رفیق چونکہ ہمیشہ اسی راستے سے لوگوں کو لے کر آتا جاتا تھا اس لیے

بس کنڈکٹر سے لے کر بس ڈرائیور اور پولیس کے سپاہی تک سب سے اس کی گہری واقفیت تھی۔ وہ اُن کی پان، سگریٹ اور ناشتہ کے علاوہ روپیوں سے بھی خاطر مدارت کرتا رہتا تھا، اس لیے تمام لوگ اس کے دوست تھے اور خاموش رہتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ ان کا کام چلتا اور نہ دلّال روفیک کا۔ روفیک نے گزشتہ پانچ سال سے یہ کام شروع کیا تھا اور اس عرصے میں کافی رقم بنا لی تھی۔

وہ زینت اور دونوں بچوں کے ساتھ کھڑکی کے کنارے والی نشست پر بیٹھ گیا۔ دوسرے لوگ جہاں بن پڑا بیٹھ گئے۔ جیسور اور ساتکھیرا کے درمیان پچیس میل کا فاصلہ تھا اور بس وہاں دو ڈھائی گھنٹے میں پہنچتی تھی۔ وہ خاموش تھا اور آنے والے دنوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ حال کی طرح مستقبل بھی تاریک تھا اور اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر بھی وہ واپس جا رہا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے۔ اس اثنا میں اس نے اپنے قدم بہت حد تک جما لیے تھے۔ اخبار میں اس کی اچھی خاصی ملازمت تھی اور وہ اپنی موجودہ زندگی سے قطعی مطمئن تھا، لیکن ایک دن اس نے اچانک لَوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

اسے اس ملک سے جذباتی لگاؤ تھا۔ اس نے طالب علمی کے زمانے سے قیام پاکستان تک تحریکِ پاکستان میں سرگرم حصّہ لیا تھا حالانکہ اس کے والد اس کے سخت خلاف تھے اور انھوں نے اُسے ان سرگرمیوں سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن وہ محلّے کے لڑکوں کے ساتھ چوری چھپے لیگ کے جلسوں میں جایا کرتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے والد کے سوا محلّے کے تمام لوگوں کی ہمدردی مسلم لیگ کے ساتھ تھی۔

وہ جب میٹرک کا طالب علم تھا اس وقت دوسری عالمگیر جنگ ختم ہوئی تھی اور ساتھ ہی سارے ہندوستان میں آزادی کی تحریکیں پھوٹ پڑی تھیں۔ پھر آزاد ہند فوج کے سپاہیوں پر مقدمہ چلنے سے لے کر بحری بیڑے کے جہازیوں کی بغاوت، کیبنٹ مشن کی آمد

مسلم لیگ اور کانگریس کی مخلوط وزارت اور کلکتہ میں مطالبۂ پاکستان کی حمایت میں ڈائرکٹ ایکشن تک تمام واقعات اس کے سامنے رونما ہوئے تھے۔ آج بھی یہ واقعات اس کے ذہن میں تازہ تھے۔ اس نے اِن تمام واقعات سے گہری دلچسپی لی تھی۔ وہ اُس وقت ایک کم شعور، لیکن جوشیلا نوجوان تھا اور انگریزوں سے شدید نفرت کرتا تھا۔

اس نے ابھی میٹرک کا امتحان پاس ہی کیا تھا کہ وہ نیشنل گارڈ میں شامل ہوگیا۔ چند ہی دنوں میں اس نے محلّے کے لڑکوں کو جمع کرکے نیشنل گارڈ کا علاقائی یونٹ قائم کرلیا اور خود اس کا کمانڈر بن گیا۔ ابتدا میں اس کے والد نے اُسے ان باتوں سے منع نہیں کیا اور بچّہ سمجھ کر نظر انداز کردیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ عارضی جوش و خروش ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سر دپڑ جائے گا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اور وہ مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں حصّہ لیتا رہا۔ اُس کے والد کی مخالفت بڑھتی گئی۔ وہ دراصل دیوبند کے طالب علم رہ چکے تھے اور ذہنی طور پر کٹّر قوم پرست اور پاکستان کے مخالف تھے۔

اِس کے بعد نواکھالی، بہار اور سارے ہندوستان میں بھیانک فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے۔ اس نے کلکتہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کرتے، دُکانوں کو لُوٹتے اور گھروں کو آگ لگاتے دیکھا۔

——— اور پھر ایک دن پاکستان قائم ہوگیا۔

کلکتے اور ہندوستان کے مختلف حصّوں سے لوگ بڑی تعداد میں ترکِ وطن کرکے پاکستان چلے آئے۔ اُس کے بچپن کے دوست اور محلّے کے بہت سے ساتھی پاکستان چلے گئے، لیکن صرف اُس کا گھرانہ پاکستان نہ جاسکا۔ اس کے والد مولوی برکت علی پُرانے خیال کے کانگرسی مسلمان تھے اور وہ کسی حال میں اپنا گھر اور اپنا آبائی وطن چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اُنھیں اپنے در و دیوار سے اتنی محبّت تھی کہ انھوں نے اعلان کر رکھا تھا کہ اگر ہندو اُن کے گھر میں آگ بھی لگادیں گے تو بھی وہ یہ گھر نہیں چھوڑیں گے! اس کے والد کی طبیعت ہمیشہ خراب رہنے لگی تھی اور ضعیف ہوجانے

کے باعث کافی چڑچڑے مزاج ہو گئے تھے۔ وہ جب بھی اُن سے پاکستان چلنے اور وہاں کاروبار اور ملازمت کے بہتر امکانات کے بارے میں کہتا، مولوی برکت علی بڑے صبر و تحمّل سے اس کی باتیں سُنتے اور پھر بڑے منطقی لہجے میں کہتے "مسلمان وہ ہے جو دوسرے مسلمانوں کے سُکھ میں سُکھ اور دُکھ میں دُکھ محسوس کرے۔ وہ مسلمان، مسلمان نہیں جو صرف اپنے بارے میں سوچے۔ مان لیا کہ تمہارے پاکستان میں کاروبار اور ملازمت کے بہتر مواقع ہیں، لیکن ذرا سوچو، اُن مسلمانوں کا کیا بنے گا جو یہاں رہ جائیں گے۔ اگر تمہارا پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کا اتنا ہی بہی خواہ ہے تو وہ ہندوستانی مسلمانوں کو کیوں نہیں بلا لیتا؟ کیوں انھیں اپنے ہاں جگہ نہیں دیتا؟"

یہ ایسا سوال تھا، جسے سُن کر وہ خاموش ہو جاتا اور اس سے جواب نہ بن پڑتا۔ وہ لاکھ باشعور سہی لیکن منطقی بحث میں مولوی برکت علی کے دلائل کے سامنے ہار مان لیتا۔

۱۹۵۰ء میں ایک بار پھر کلکتے میں بڑے پیمانے پر فساد ہوا۔ بہت سے مسلمانوں کے گھر جلا دیئے گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ بے گھر ہو گئے۔ ہر طرف افراتفری پھیل گئی اور ایک بار پھر مسلمان بڑی تعداد میں ترکِ وطن کر کے مشرقی پاکستان آ گئے، لیکن اس دفعہ بھی مولوی برکت علی کے ارادے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

اُس کے بچپن کے دوست انور نے اُسے کھلنا سے لکھا:

"مشرقی پاکستان کے عوام مہاجروں کا پُرتپاک خیر مقدم کر رہے ہیں۔ حکومت اور عوام کی جانب سے پناہ گزینوں کے استقبال کے لیے مختلف ضلعی شہروں میں ریلیف کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں، حکومت کی طرف سے انھیں آباد کیا جا رہا ہے، انھیں زمین اور مکانات دیئے جا رہے ہیں، ملازمتوں کے حصول میں بھی کوئی خاص دِقّت نہیں ہے۔ بنگالی مسلمان بہت پس ماندہ ہیں۔ میٹرک اور آئی اے پاس لوگ بڑے بڑے عہدوں پر لیے جا رہے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنر مند لوگوں کی بڑی مانگ ہے۔ یہ ایک نیا اور پس ماندہ

ملک ہے۔ یہاں صنعت و تجارت کی ترقی کے بہترین مواقع ہیں۔ اگر کوئی بیس پچیس ہزار کے سرمائے سے تجارت شروع کرے تو وہ چند برسوں میں لکھ پتی بن سکتا ہے۔ یہاں کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا، سوائے دھان اور پٹ سن کے۔ تمام چیزیں باہر سے آتی ہیں۔ یہاں ہر قسم کے کاروبار کے لیے امکانات موجود ہیں۔ یہاں آکر راتوں رات لکھ پتی بننے کا یہ بہترین موقع ہے۔"

اُس کے کالج کے دوست سعید نے اُسے ڈھاکے سے لکھا:

"کلکتے کے فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے پاکستان کے ہندوؤں میں زبردست خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ ڈھاکہ اور کھلنا میں فسادات جاری ہیں جس کے باعث ہندو اپنی جائیدادیں کوڑیوں کے مول فروخت کر کے یا ہندوستان میں مسلمانوں کی جائیدادوں سے تبادلہ کر کے بھاگ رہے ہیں۔ اس نے خود بھجوہری شاہا اسٹریٹ میں ایک بیگھہ زمین پر واقع پختہ مکان صرف دس ہزار روپے میں خریدا ہے۔ ہندوؤں کی جائیداد سستے داموں خریدنے کا یہ بہترین موقع ہے اس لیے فوراً پاکستان آجاؤ۔ اس کے والد اگر یہاں کسی ہندو کی جائیداد سے اپنی جائیداد کا تبادلہ کرنا چاہیں تو وہ اس کا بھی انتظام کر سکتا ہے۔ اس کے پڑوس کے ایک ہندو نے درخواست کی ہے کہ وہ اس کی ڈیڑھ بیگھہ زمین پر واقع "راج باڑی" کے تبادلے کا انتظام کر دے۔ اس کی یہ کوٹھی مدن موہن بیساکھ روڈ پر واقع ہے۔ عام حالات میں اس کی قیمت کم سے کم ڈیڑھ لاکھ روپے ہوگی۔ لیکن یہ شخص اسے صرف پچاس ہزار میں فروخت کرنے کے لیے تیار ہے۔ اگر نقد روپے نہ ہوں اور ہندوستان میں صرف پچاس ہزار کی جائیداد ہو تو بھی وہ اس سے تبادلہ کرنے پر آمادہ ہے۔"

سعید نے اسے مزید لکھا، اب اس نے یہاں ہندوؤں کی جائیدادیں سستے داموں خریدنے اور زیادہ قیمت پر فروخت کرنے کا کاروبار شروع کر دیا ہے اور خدا کے فضل و کرم سے اس وقت اس کے پاس ایک لاکھ روپیہ بینک بیلنس ہے۔ اُس نے اُسے فوراً ڈھاکہ آنے اور اُس کے کاروبار میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی اس لیے کہ وہ تنہا ہے اور اس نے اپنا کاروبار بہت پھیلا لیا ہے۔ اُسے اُس جیسے محنتی اور ایماندار شخص کی ضرورت ہے۔

سعید کے ذریعے ہی اسے معلوم ہوا کہ زاہد اِن دنوں ای۔پی۔ واپڈا میں مائننز ڈائرکٹر ہے اور کئی ہزار روپے تنخواہ پانے کے علاوہ دفتر کی طرف سے اُسے کار اور بنگلہ بھی فراہم کیا گیا ہے، حالانکہ وہ محض سائنس گریجوئٹ ہے۔ سعید نے اپنے خط میں اس کے مشترکہ دوستوں کا تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ اس کے تمام دوست اِس وقت گورنمنٹ یا پرائیویٹ کمپنیوں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ سعید نے لکھا، وہ اگر پاکستان آئے تو اُس جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کے لیے ہزار، دو ہزار روپے کی ملازمت فراہم ہونا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

اتنی ساری ترغیبوں اور سبز باغ دکھلائے جانے کے باوجود مولوی برکت علی نے اسے پاکستان جانے کی اجازت نہیں دی اور نہ خود ہی پاکستان جانے پر رضامندی ظاہر کی۔ ان کا خیال تھا کہ اس وقت جو فسادات ہو رہے ہیں، وہ عارضی ہیں۔ یہ بلوے ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتے۔ اتنے بڑے شہر کا نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے حکومت کا بلوائیوں پر قابو پانا ضروری ہے۔ چند دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان کا خیال درست ثابت ہوا۔ اتفاق سے چند دنوں میں سب ٹھیک ہو گیا۔ حکومت نے ہنگاموں پر قابو پا لیا شہری زندگی اعتدال پر آ گئی اور مسلمان چین کی سانس لینے لگے۔ شہر اتنا بڑا اور وسیع تھا اور اتنی زیادہ گہما گہمی تھی کہ مسلمانوں کو یاد ہی نہیں رہا کہ کبھی فساد بھی ہوا تھا۔

چودہ سال تک کلکتے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اس نے چودہ سال کا طویل عرصہ بڑے امن اور سکون کے ساتھ گزارا۔ اتنے دنوں تک کامل امن و امان رہنے کے

باعث اس نے فرض کرلیا کہ اب کبھی فساد نہیں ہوگا۔ اس کی طرح جو لوگ پاکستان آنے کے لیے پَر تول رہے تھے، انھوں نے ترکِ وطن کا خیال ترک کردیا۔

لیکن پھر سب کچھ بدل کر رہ گیا۔

کھلنا میں انتخابی ہنگامے نے فرقہ وارانہ فسادات کی صورت اختیار کرلی اور ڈھاکا اور نرائن گنج فسادات کی لپیٹ میں آگئے۔ جس کا کلکتے پر فوری ردِّ عمل ہوا اور بڑے پیمانے پر فسادات شروع ہوگئے۔ موتی جھیل، بلیا گھٹہ، ناریکل ڈانگہ، بٹوار بگان، کیلا بگان، بج بج، واٹ گنج اور مانسہ تلہ میں خوب خون کی ندی بہی۔ مسلمانوں کے محلّے کا محلّہ نذرِ آتش کردیا گیا اور اس بلوے میں اس کا گھر بھی محفوظ نہ رہا، حالانکہ محلّے کے ہندوؤں کو معلوم تھا کہ مولوی برکت علی کٹّر کانگریسی، منڈل کانگریس کے پردھان سچیو اور پاکستان کے سخت مخالف ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے انھیں نہیں بخشا۔ شاید اس لیے کہ مولوی برکت علی مسلمان تھے اور فرقہ وارانہ جنگ میں سیاسی نظریہ نہیں، فرقہ دیکھا جاتا ہے۔ اس نے اتفاق سے گھر پر حملہ ہونے سے کچھ قبل اپنی چھوٹی بہن ساجدہ۔ نو بیاہتا بیوی زینت اور ماں باپ کو دوسری جگہ منتقل کردیا تھا جس کی وجہ سے ان کی زندگی محفوظ رہی۔

وہ لوگ دو ماہ تک حاجی موسیٰ صالح جی کے مسافر خانے میں پناہ گزیں رہے۔ اس سانحہ نے اُس سے کہیں زیادہ مولوی برکت علی کو متاثر کیا۔ انھیں اپنے آبائی وطن اور گھر سے بے حد محبّت تھی۔ انھوں نے اپنی آخری سانس اپنے وطن میں ہی ترک کرنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن اس حادثے نے انھیں گہرا صدمہ پہنچایا اور اس نے جب آخری بار پاکستان چلنے کی تجویز پیش کی تو مولوی برکت علی نے اس کی مخالفت نہیں کی اور جمیل کے ترکِ وطن کے فیصلے کو خاموشی سے مان لیا۔ اِس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ وہ ایک ایسے ملک میں پناہ لینے پر مجبور ہو رہے تھے جس کی انھوں نے ہمیشہ مخالفت کی تھی۔ انھیں اپنے آدرش کی شکست کا شدید احساس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس حادثے کے بعد خاموش خاموش رہنے لگے اور انھوں نے خانہ داری کی

ساری ذمّہ داری جمیل پر چھوڑ دی اور خود مکمّل گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

جمیل نئی نویلی بیوی، شیر خوار بچّہ، جوان بہن اور ضعیف والدین کے ساتھ سرحد عبور کر کے پاکستان آگیا اور جیسور کے ریفیوجی کیمپ میں پناہ گزیں ہوا۔ گھر پہلے ہی جل چکا تھا۔ اس نے زمین ایک مارواڑی کے ہاتھوں اونے پونے فروخت کر دی۔ اس مارواڑی کا پاکستان میں بھی کاروبار تھا۔ اُسے روپیہ منتقل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ چند روز ریلیف کیمپ میں رہنے اور ریفیوجی کارڈ بنانے کے بعد ڈھاکہ آگئے اور میرپور کے ایک چھوٹے سے مکان میں ٹھہرے۔ جمیل نے ہُونڈی کے ذریعہ جو روپیہ منتقل کیا تھا، اس سے ان کا چند دنوں تک گزر بسر ہوتا رہا۔

اس عرصے میں اس نے اپنے دوستوں کا سراغ لگا لیا، جو واقعی بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ان کے پاس اعلیٰ عہدوں کے علاوہ بنگلے اور کاریں بھی تھیں۔ وہ اُن کے ٹھاٹھ باٹ دیکھ کر اپنی خستہ حالی پر شرم محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کے دوستوں کو جب معلوم ہوا کہ وہ ترکِ وطن کر کے آگیا ہے تو انھوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ ہر جگہ اس کی پذیرائی ہوئی اور پرانے دوست گزرے ہوئے دنوں کی یاد میں کھو گئے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ وہ تباہ ہو کر آیا ہے اور اس کا مکان نذرِ آتش کر دیا گیا ہے تو انھوں نے اس کی نقد روپیوں سے مدد کرنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن اس نے اِسے قبول نہیں کیا۔ گفتگو کے دوران جب ملازمت کا ذکر آیا تو انھوں نے منہ لٹکاتے ہوئے بڑے معذرت طلب لہجے میں کہا "اِن دنوں غیر بنگالیوں کو ملازمت کے سلسلے میں بڑی دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ نیو اپوائنٹ منٹ کے سلسلے میں انھیں نہایت سختی کے ساتھ "سن آف دی سوئیل" کو ترجیح دینے کی ہدایت کی گئی ہے، اس لیے وہ فی الحال کچھ کرنے سے معذور ہیں، البتہ مستقبل قریب میں گنجائش نکل سکتی ہے۔ انھوں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہا، وہ اپنے پارٹی کُلر کے ساتھ درخواست دے جائے وہ اس کے لیے ضرور کوشش کریں گے۔" اس کے بعض دوستوں نے

روانگی کے وقت احساسِ ندامت سے اس کی جیب میں روپے بھی ڈال دیئے لیکن اس نے اسے لوٹا دیئے۔

اس نے اس بارے میں اپنے دوستوں سے کبھی شکایت نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ اس میں اس کے دوستوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس نے ہی آنے میں بہت تاخیر کر دی ہے۔ مہاجروں کو ملازمت کے حصول میں طرح طرح کی دشواریاں درپیش ہیں۔ اب یہاں لوگ بنگالی اور غیر بنگالی تھے، کوئی پاکستانی نہیں تھا۔ اس نے سوچا۔ اسلام کا رشتہ کتنا نازک ہو چکا ہے۔ دو قومی نظریے کی بنیاد پر قائم ہونے والا ملک کئی قومی نظریے اپنا رہا ہے!

اُس نے آنے میں واقعی بڑی تاخیر ہو چکی تھی۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد یا ۱۹۵۰ء میں جو لوگ ترکِ وطن کر کے آئے تھے، وہ مکمل طور پر آباد ہو چکے تھے اور قطعی مطمئن تھے۔ مہاجرین کی بڑی تعداد کو میرپور، محمد پور یا ڈسنگ اسٹیٹوں میں آباد کیا جا چکا تھا۔ ہندوستان میں جو معمولی حیثیت کے لوگ تھے، یہاں بڑی بڑی جائیدادوں کے مالک بن چکے تھے، جو پہلے سے ذی حیثیت تھے، ان کا شمار ملک کے متمول لوگوں میں ہونے لگا تھا اس اثنا میں مہاجرین میں ایک نو دولتیہ طبقہ پیدا ہو چکا تھا، جس نے تجارت و صنعت میں جائز اور ناجائز پرمٹوں، لائسنسوں، چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کے ذریعہ کروڑوں روپے کما لیے تھے، جس کے سامنے زندگی کا صرف ایک مقصد تھا اور وہ تھا حصولِ دولت اور صرف دولت۔

۱۹۶۴ء میں جو لوگ ترکِ وطن کر کے آئے، انھیں یہاں بے حد جدوجہد کرنی پڑی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے "ینگ آبزرور" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ملازمت مل گئی، جہاں اسے تمام غیر بنگالیوں نے ملازمت دینے سے انکار کر دیا تھا وہاں ایک بنگالی نے ملازمت دے دی۔ اُسے یہ ملازمت زبردست مقابلے کے بعد قطعی غیر متوقع طور پر حاصل ہوئی۔ اس نے اخبار میں اشتہار پڑھ کر بڑی بے دلی کے ساتھ درخواست دی، لیکن اتفاق سے اُس کے نام انٹرویو لیٹر آگیا۔ اس نے کلکتہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے کیا تھا، وہ کالج کے زمانے سے ہی انگریزی

میں مضامین لکھتا رہا تھا جو پہلے کالج میگزین اور پھر کلکتہ کے معروف اور نیم معروف جریدوں میں شائع ہوتے رہے تھے۔ اس کا انگریزی جریدوں میں لکھنے کا تجربہ انٹرویو میں کام آیا۔ اسے دوسرے امیدواروں کے ساتھ تحریری اور زبانی امتحان میں بیٹھنا پڑا اور وہ کامیاب قرار دیا گیا۔

اسے ملازمت ملنے پر گھر والوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی، خصوصاً اس کی بہن ساجدہ اور بیوی زینت نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ وہ لوگ اس کی مسلسل بے روزگاری سے بہت پریشان تھے۔ اس کی والدہ دن رات جائے نماز پر بیٹھی اس کی روزگار کے لیے دعائیں مانگتی رہتی تھیں۔ مولوی برکت علی بظاہر خاموش اور پُرسکون نظر آتے تھے، لیکن وہ بھی دل ہی دل میں بہت پریشان تھے۔ کلکتے سے لُٹ لُٹا کر آنے کے بعد ابھی تک معاش کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں نکلا تھا اور جمع شدہ پونجی نہایت تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ وہ ہر روز ایک دفعہ نہایت خاموشی سے اس کی والدہ سے اس کے کام کے بارے میں پوچھتے اور نفی میں جواب پاکر خاموش ہو جاتے اور ان کی گہری سانس چند لمحوں کے لیے فضا میں گونج اٹھتی۔ مولوی برکت علی کو جب معلوم ہوا کہ اسے اخبار میں اچھی ملازمت مل گئی ہے تو وہ رب العزّت کی بارگاہ میں سربسجود ہو گئے اور شکرانے کی نماز ادا کی۔

اس کی ملازمت نے گھر کا نقشہ ہی بدل دیا۔ پہلی تنخواہ ملتے ہی جمیل، اپنی والدہ کے لیے ٹنگائیل کی سوتی ساڑی، مولوی برکت علی کے لیے سلیم شاہی جوتی اور ساجدہ اور زینت کے لیے جمپر اور شلوار کے کپڑے خرید لایا اور دوسرے دن ساجدہ کو ایڈن گرلز کالج میں داخل کرا دیا۔ کلکتے میں میٹرک کا امتحان دیتے ہی ہنگامہ شروع ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے اس کی تعلیم منقطع ہو گئی تھی۔ جمیل کو معلوم تھا کہ زمانہ تیزی کے ساتھ کروٹ بدل رہا ہے اور آج کے دور میں لڑکیوں کو تعلیم دلانا نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر لڑکی کی شادی میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ساجدہ تیزی سے جوانی کی منزلیں طے کر رہی تھی اور والدین کی طرح اسے بھی ابھی سے ساجدہ کی شادی کی فکر دامن گیر تھی۔

پاکستان آنے کے بعد اس کے گھر کا رہن سہن بھی بدل گیا تھا۔ سب سے پہلے جمیل نے ساجدہ اور زینت کا پردہ اٹھوا دیا۔ اس وقت وہ جس قسم کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ڈھاکے میں ذرائع آمد و رفت کی جو دشواریاں تھیں، اس کے پیش نظر برقعہ پہن کر بس پر سفر کرنا اور بھی مشکل تھا۔ پاکستان کے بدلے ہوئے ماحول میں مولوی برکت علی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی، کیوں کہ جب اپنا وطن چھُٹ چکا ہو، اور وطن کے ساتھ تمام قدیم روایتیں اور قدریں ختم ہو چکی ہوں تو تبدیل شدہ ماحول میں ان قدروں کا ماتم بے سود ہوتا ہے، حالانکہ یہ وہی مولوی برکت علی تھے، جو پردے کی ذرا سی خلاف ورزی پر گھر سر پر اٹھا لیتے تھے، لیکن اب وہ بہت نرم پڑ چکے تھے اور جمیل کو بعض دفعہ خود حیرت ہوتی تھی کہ کیا یہ وہی برکت علی ہیں، جن کے رعب اور دبدبے سے سارا گھر تھر تھر کانپتا تھا اور جن کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

اُس کے اخبار میں اس کے علاوہ بمشکل ایک یا دو غیر بنگالی اسٹاف تھے، جس کی وجہ سے فرصت کے اوقات میں ملک کی سیاسی صورتِ حال خصوصاً بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے تعلقات زیرِ بحث آتے رہتے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے تعلقات نہایت تیزی سے بگڑتے جا رہے ہیں اور انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ وہ مغربی پاکستان کی نوآبادی بن چکے ہیں غیر بنگالی صنعت کار اور تاجر، ان کا استحصال کر رہے ہیں۔ گزشتہ دس برسوں میں لوٹ کھسوٹ نے بڑی شدت اختیار کر لی تھی۔ ملک کا سرمایہ دار طبقہ بنگالی مزدوروں کے ساتھ ساتھ غیر بنگالی مزدوروں کا بھی استحصال کر رہا تھا لیکن اس استحصال کو صرف بنگالیوں کے استحصال سے تعبیر کیا جا رہا تھا۔ قوم پرست سیاست دانوں نے مقامی اور غیر مقامی عوام کے درمیان منافرت پھیلانے کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ کرنافلی اور آدم جی نگر میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان بڑے پیمانے پر تصادم ہو چکا تھا اور گزشتہ دس برسوں میں صوبائی عصبیت کی جڑیں بہت گہرائی تک پہنچ چکی تھیں اب مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی کھلم کھلا باتیں ہونے لگی تھیں۔ بنگالیوں کی انتہا پسندی کا ردِ عمل غیر بنگالیوں کی انتہا پسندی کی صورت میں ظاہر ہونے لگا تھا اور دونوں

فرقوں کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

وہ بگڑتی ہوئی صورتِ حال سے بہت پریشان تھا اور کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اسے بعض دفعہ اپنے پاکستان آنے پر افسوس ہوتا تھا اور کبھی ہندوستان میں مسلمانوں کا حال دیکھ کر پاکستان کی حالت غنیمت نظر آتی۔ دوسری جانب اس کی والدہ کا اصرار تھا کہ ساجدہ کو مزید پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس نے میٹرک تک تعلیم مکمل کر لی ہے اس لیے جہاں تک ہو سکے اس کے ہاتھ جلد پیلے کر دیئے جائیں۔ وہ اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ ایک دن جناح ایونیو میں اس کی ملاقات عبدالرحیم چچا سے ہو گئی۔ عبدالرحیم چچا ریلوے سے وابستہ تھے۔ وہ اس کے والد کے گہرے دوستوں میں سے تھے اور قیام پاکستان کے بعد ہی ڈھاکہ آ گئے تھے اور ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد بہاولپور میں مقیم تھے۔ پراویڈنٹ فنڈ سے انھیں جو روپیہ ملا تھا اس سے انھوں نے وہاں گھر بنا لیا تھا اور اب اپنے بچوں کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ بڑے بیٹے سلیم کی شادی ہو چکی تھی اور اب منجھلے بیٹے کریم کے لیے ایک خوب صورت اور خوب سیرت لڑکی کی تلاش تھی۔ انھیں جمیل اور اس کے والد کے پاکستان آ جانے کا علم نہیں تھا چنانچہ انھیں جب معلوم ہوا کہ مولوی برکت علی بھی ڈھاکے میں ہی مقیم ہیں تو انھوں نے فوراً اپنے دوست سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور جمیل انھیں اپنے گھر لے آیا۔

مولوی برکت علی، عبدالرحیم چچا سے مل کر بہت خوش ہوئے اور گھنٹوں بیتے ہوئے دنوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پھر انھوں نے اپنی حالت اور اپنے مسائل بیان کیے۔ عبدالرحیم چچا کو جب معلوم ہوا کہ مولوی برکت علی اپنی بیٹی ساجدہ کی جلد از جلد شادی کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے فوراً اپنے بیٹے سلیم کے لیے ان سے ساجدہ کا رشتہ مانگ لیا۔ انھوں نے ساجدہ کو بچپن میں اپنی گود میں کھلایا تھا۔ اس وقت عبدالرحیم چچا، مولوی برکت علی کے پڑوسی تھے اور دونوں گھرانوں میں بڑے گہرے مراسم تھے۔ ساجدہ بچپن میں سلیم کے ساتھ کھیل چکی تھی۔ اس لیے دونوں کسی حد تک ایک دوسرے سے واقف تھے۔ عبدالرحیم چچا نے مولوی برکت علی سے کہا "مجھے کچھ نہیں چاہیے، نہ زیورات، نہ کپڑے،

اور نہ جہیز، مجھے صرف ساجدہ بٹیا کا ہاتھ چاہیے۔ میں اسے رانی بنا کر رکھوں گا۔"

یہ سُن کر خوشی کے مارے مولوی برکت علی کی آنکھیں بھر آئیں اور انھوں نے جذبات سے مغلوب ہو کر عبدالرحیم چچا کا ہاتھ تھام لیا، جیسے وہ اس کے لیے بڑے ممنون ہوں۔ طے یہ پایا کہ چونکہ بیگم عبدالرحیم ہمیشہ بیمار رہتی ہیں اور ان کے لیے سفر کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے عبدالرحیم چچا آئندہ ماہ ڈھاکہ آئیں گے اور مولوی برکت علی، ان کی بیگم اور ساجدہ کو اپنے ساتھ پاربتی پور لے جائیں گے اس طرح چچی جان، اس کی والدہ اور ساجدہ سے بھی مل لیں گی اور تمام باتیں وہیں طے پا جائیں گی۔

عبدالرحیم چچا حسب وعدہ ایک ماہ بعد ڈھاکہ پہنچ گئے، لیکن شہر کی صورتِ حال بہتر نہ ہونے کے باعث فوری طور پر پاربتی پور روانہ نہ ہو سکے۔ وہ سب کو جلد از جلد پاربتی پور لے جانا چاہتے تھے لیکن ان کے ڈھاکہ آنے کے بعد احتجاجی جلسوں، جلوسوں اور ہڑتالوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ دس سال کے زبردست حبس کی وجہ سے ہوا کا دباؤ بہت بڑھ چکا تھا اور ہوا کے دباؤ نے آخر کار زبردست طوفان کی صورت اختیار کر لی تھی۔ عوامی بیداری اور طلبا کی تحریکوں نے پورے صوبے کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور اس بے چینی اور انتشار نے عام بغاوت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ڈھاکہ اور ضلعی شہروں اور قصبوں میں آئے دن سیاسی ہڑتالیں اور مظاہرے ہو رہے تھے۔ عوام میں پہلے ہی صوبائی عصبیت موجود تھی، اس پر سیاسی ہنگاموں کے دوران حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی جماعتوں نے اس عصبیت کو خوب خوب ہوا دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آمریت کے خلاف تحریک نے جلد ہی فرقہ وارانہ شکل اختیار کر لی اور بنگالی اور غیر بنگالی عوام میں کشیدگی اور بداعتمادی انتہا کو پہنچ گئی۔ انگریزی کے ساتھ اردو کے سائن بورڈ اور ناموں کی تختیاں بھی مٹائی جانے لگیں۔ شہر کی دیواروں اور بڑے بڑے کراس فرنٹ... "اردو زبان برباد"، "بنگالی جاگو اور بھاگو بہاری بھاگو" کے نعرے نظر آنے لگے۔ ... بنگالی بہاری فساد نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ باہمی بداعتمادی کی

انتہا یہ ہوئی کہ مہاجرین بسوں، ٹرینوں اور سینماؤں میں اردو میں باتیں کرتے ہوئے ڈرنے لگے۔ ایسے حالات میں عبدالرحیم چچا اُن سب کو پاربتی پور لے جانے پر مُصر رہے اور مولوی برکت علی سے انکار کرتے نہ بنا۔ معاملہ لڑکی کے رشتے کا تھا اس لیے جمیل نے بھی مخالفت نہیں کی اور اُس کے اور زینت کے علاوہ تمام لوگ پاربتی پور روانہ ہو گئے۔

ان کے ڈھاکہ سے روانہ ہونے کے دوسرے دن ریڈیو سے پاربتی پور میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان فساد ہو جانے کی خبر نشر ہوئی اور اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اخبارات کی خبروں میں بتایا گیا کہ طلبا کے دو گروہوں میں "یوم سیاہ" منانے کے سوال پر تصادم ہو گیا، جس نے فوراً فرقہ وارانہ شکل اختیار کر لی۔ بہاری کیمپ، صدیقی محلہ، رحمت نگر، گل پاڑا، امریکن کیمپ اور نارتھ یارڈ میں سیکڑوں مکانات جلا دیئے گئے۔ چاقوؤں، چھریوں، لاٹھیوں اور بندوقوں کا آزادانہ استعمال ہوا اور سیکڑوں کی تعداد میں مشتعل دیہاتیوں نے کھولہ ہاٹی اسٹیشن میں ڈھاکہ میل پر حملہ کر کے بوڑھوں، بچوں اور جوانوں کو قتل اور عورتوں کو اغوا کر لیا اور ان کے ساتھ منہ کالا کر کے ان کی لاشیں تالاب میں پھینک دیں۔

اس اطلاع نے جمیل کے ہوش اڑا دیئے اور وہ پاگلوں کی طرح کملا پور اسٹیشن کی جانب بھاگا۔ معلوم ہوا کہ پاربتی پور اور اس کے نواح میں کرفیو لگا ہوا ہے اور گاڑیوں کی آمد و رفت بند ہے۔ اس نے ٹرنک کال کے ذریعہ خیریت معلوم کرنی چاہی، لیکن اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ ڈھاکہ اور پاربتی پور کے درمیان ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ آخر کار تیسرے دن ٹرین سروس جاری ہوتے ہی وہ بمشکل پاربتی پور پہنچا اور اس نے وہاں پہنچ کر جو کچھ دیکھا اور چچا عبدالرحیم کے بیٹے سلیم کی زبانی جو کچھ سُنا، اُس نے اسے پاگل کر دیا۔ اس پر کئی دنوں تک دیوانگی کی کیفیت طاری رہی اور وہ جب قدرے سنبھلا تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس صدمے سے وہ شدید بیمار پڑ گیا۔ بلوائیوں نے ٹرین کے دوسرے مسافروں کے ساتھ چچا عبدالرحیم، مولوی

برکت علی اور اس کی والدہ کو شہید کر دیا تھا اور ٹرین کی دوسری جوان عورتوں کے ساتھ
۔ جدہ کو بھی اغوا کر لیا تھا اور اس کی لاش چار دنوں کے بعد ایک تالاب سے برآمد ہوئی تھی۔

اس نے اپنے آپ سے سوال کیا "کیا حاصل ہوا یہاں آکر؟"

وہ اپنے سوال پر خود ہی ہنس پڑا۔ آج، جب کہ وہ اِس ملک کو چھوڑ کر جا رہا تھا، یہ سوال اُس کے لیے بے معنی تھا۔ تاہم وہ پاکستان چھوڑنے سے قبل ایک بار ماضی کی جانب نگاہیں اُٹھا کر دیکھنا اور نفع و نقصان کا اندازہ لگانا چاہ رہا تھا۔

بس کے سات کھیرا پہنچتے ہی تمام لوگ اُتر گئے۔ سورج ڈھل چکا تھا اور شام کا دُھندلکا آہستہ آہستہ چھا رہا تھا۔ وہ لوگ کچھ دُور پیدل چلنے کے بعد ایک جھونپڑی میں آکر ٹھہرے، جہاں اُنھیں رات گزارنی تھی۔ شام ہو جانے کی وجہ سے سرحد سے پانچ میل کے علاقے میں کرفیو لگ چکا تھا اور رات کو سرحد عبور کرنا ممکن نہ تھا۔ اُنھیں رات بھر اس جھونپڑی میں گزارنے کے بعد صبح سویرے اپنی منزل کی جانب کوچ کرنا تھا۔ یہ بہت بڑی جھونپڑی تھی، جس میں بیس پچیس افراد بہ آسانی سو سکتے تھے۔ دلّالوں نے اس کا انتظام بطور سرائے کے کر رکھا تھا۔ ان کے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ایک دوسرا قافلہ وہاں پہنچا، جو کئی خاندانوں پر مشتمل تھا اور ابھی ابھی ہندوستان سے سرحد عبور کر کے آیا تھا۔ اُنھیں بھی اِسی جھونپڑی میں رات بسر کرنی تھی۔ اس قافلے میں اس کی ملاقات اس کے کالج کے ساتھی اسلم سے ہو گئی، جو اس کے ہی محلّے میں رہتا تھا اور ابھی ابھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ کلکتے سے آیا تھا۔

ایک دوسرے کو دیکھتے ہی دونوں خوشی سے بغل گیر ہو گئے۔ اسلم اُس سے اُس کے خطوں کے جواب نہ دینے کی شکایتیں کرتا رہا اور ایک ہی سانس میں اُسے بہت ساری صلواتیں سنا دیں۔ اسلم نے اپنے خط میں پاکستان آنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور اُس سے اس سلسلے میں مشورہ طلب کیا تھا، جس کے جواب میں اُس نے اُسے صاف لفظوں میں پاکستان آنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کے بعد اسلم کے جو خط آئے اُس میں اس نے بار بار پاکستان آنے کے

ارادے کا اظہار کیا تھا۔ جس کا وہ بھلا کیا جواب دیتا؟

اُس نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی "اسلم! تم میرے ساتھ واپس لوٹ جاؤ۔ یہاں ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہے!"

"نہیں یار! تم نہیں جانتے ہم مسلمان وہاں کس عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

"میں نہیں جانتا؟" اس نے سوچا "میں نہیں جانتا کہ وہاں مسلمان کس عالم میں زندگی گزار رہے ہیں؟ چار سال کے عرصے میں اسلم بھی مجھے ان لوگوں میں شمار کرنے لگا ہے جو پاکستان آنے کے بعد یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کبھی ہندوستانی مسلمانوں سے تعلق رکھتے تھے!!"

اسے اسلم کی ذہنیت پر افسوس ہوا، لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔

وہ اسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ دونوں ایک ہی جگہ پلے اور ایک ہی ساتھ اسکول اور کالج میں پڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اسلم اس کے ان چند دوستوں میں سے تھا، جس سے وہ عشق کی حد تک پیار کرتا تھا۔ وہ اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کرتا رہا اور اپنے تلخ تجربات اور مشاہدات بیان کر کے اُسے واپس لوٹ جانے پر مجبور کرتا رہا۔ اُن میں ساری رات بحث ہوتی رہی۔ زینت سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے بچے کے ساتھ سو چکی تھی، لیکن ان کی آنکھوں سے نیند اُڑ چکی تھی، اور وہ جھونپڑی کے باہر زندگی کے ایک اہم موڑ پر اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کر رہے تھے۔

وہ جمیل کی ہر دلیل اور ہر منطق کے جواب میں صرف ایک ہی بات کہتا "وہاں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ جان و مال کے علاوہ عزت و آبرو بھی خطرے میں ہے، ہمیں دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے، ایسے عالم میں وہاں کیسے رہا جا سکتا ہے؟"

وہ دل میں سوچتا "کیا یہاں جان و مال اور عزت و آبرو خطرے میں نہیں ہے؟"

وہ رات بھر کی بحث کے بعد بھی اسلم کو قائل نہ کر سکا۔ مرغ کی بانگ نے انھیں چونکا دیا۔ رات کا پچھلا پہر بھی بیت چکا تھا اور مشرقی افق پر صبحِ کاذب کی ہلکی سی روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ چند لمحوں کے بعد سورج اپنا سارا لباس اُتار کر برہنہ ہو جائے گا اور سورج کی روشنی ہر

وہ ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں گے، شاید زندگی بھر کے لیے!

تھوڑی دیر کے بعد دونوں قافلے اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ روانگی کے وقت دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے، دونوں کی آنکھیں بھر آئیں اور دونوں نے ایک دوسرے کو رُوندھی ہوئی آواز میں الوداع کہا۔ دونوں اپنے اپنے قافلے کے ساتھ مستقبل کی تلاش میں مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ ایک قافلہ سرحد عبور کر کے آچکا تھا اور دوسرا قافلہ سرحد عبور کرنے جا رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا "کیا ہم امن اور مستقبل کی تلاش میں اسی طرح بھٹکتے پھریں گے؟"

(۸ ستمبر ۱۹۶۹ء، ڈھاکہ، مشرقی پاکستان میں لکھا گیا)

تیسرا وطن

"تم نہ جاؤ صمد، مجھے تمہارے جانے کا بہت افسوس ہوگا۔"

اس کے کانوں میں ابھی تک رقیہؔ کی آواز گونج رہی تھی ۔ رقیہؔ، جسے وہ بہت پسند کرتا تھا، جس کے ساتھ وہ ساری زندگی گزار دینے کا خواب دیکھتا تھا، لیکن جسے وہ چھوڑ کر جا رہا تھا، ایک ایسے اجنبی خطّے کی جانب، جسے وہ جانتے ہوئے بھی نہیں جانتا، جس کے بارے میں اس نے صرف سُنا تھا، جسے ملک کا حصّہ ہوتے ہوئے بھی اس نے کبھی نہیں دیکھا، اور جو اس کی طرح بدنصیب اور اُجڑے ہوئے لوگوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا ۔ پھر بھی وہ جا رہا تھا اپنی ضعیف، بیمار اور قریب المرگ ماں کے ساتھ۔

اس کی ماں، دیو قامت مسافر بردار طیّارے میں اس کی بغل کی نشست پر سوئی ہوئی تھی۔ کیبن میں طیّارے کی پرواز کی مسلسل آواز گونج رہی تھی ۔ فضا میں افسردگی چھائی ہوئی تھی ۔ ہر شخص خاموش اور ملول تھا اور دل ہی دل میں اجنبی اور قطعی انجانے ماحول کے بارے میں سوچ رہا تھا، جہاں انھیں جا کر پناہ لینی تھی اور از سرِ نو زندگی شروع کرنی تھی ۔ ہر شخص مستقبل کے بارے میں

فکرمند تھا۔ معلوم نہیں وہاں کے لوگ کیسے ہوں گے۔ ان کے ساتھ کیسا سلوک کریں گے کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک ہی ملک کا شہری ہوتے ہوئے بھی وہ انھیں قبول کرنے کے لیے کیوں تیار نہیں؛ ان سے قبل جو لوگ وہاں پہنچ چکے تھے، انھوں نے اپنے خطوں میں بہت ہی حوصلہ شکن اطلاعیں دی تھیں، وہاں انھیں کوئی پسند نہیں کرتا۔ ان سے امتیازی سلوک کیا جاتا ہے، انھیں معیشت پر بار سمجھا جاتا ہے۔ مقامی آبادی ان کی آمد کے قطعی خلاف ہے۔ یہ ساری باتیں سُن سُن کر اس کی طرح لوگوں کے حوصلے اور بھی پست ہو گئے تھے۔ پھر بھی وہ اپنی بقا کے لیے وہاں جانے پر مجبور تھے۔ ہر شخص کو اپنے وطنِ ثانی کے چھٹنے، اپنے گھر بار اور جائیداد کے وہاں رہ جانے اور اپنے عزیز و اقارب کے ہلاک یا لاپتہ ہو جانے کا غم تھا اور ہر شخص اجنبی دیار میں پیش آنے والے مصائب اور صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔

وہ بھی طیّارے کی کھڑکی کے قریب بیٹھا چند لمحے قبل اپنے چھوڑے ہوئے گھر کے بارے میں سوچ رہا تھا، جسے اس نے اپنے وطن کے طور پر قبول کر لیا تھا، جہاں وہ پیدا ہوا تھا، جہاں اُس نے اپنی زبان کے ساتھ ان کی زبان بھی سیکھی تھی، ان کو اپنانا اور اُن کا احترام کرنا سیکھا تھا اور جہاں اس کے بے شمار دوست واحباب رہ گئے تھے۔ اس کے کالج اور یونیورسٹی کے زیادہ تر دوست بنگالی تھے۔ وہ ان میں مل کر اور ان کی تہذیبی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لے کر ان کا ہی ایک جُزو بن چکا تھا۔ اس نے بنگلہ زبان اتنی مہارت سے سیکھ لی تھی کہ عام لوگوں کے لیے یہ پہچاننا مشکل تھا کہ وہ بنگالی ہے یا غیر بنگالی۔

اس نے لباس بھی بنگالی نوجوانوں جیسا اختیار کر لیا تھا۔ بڑے پائنچے کا سفید پاجامہ، گیروا رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا اور اس پر سیاہ رنگ کی صدری، جو پہلے نہرو کٹ اور اب مجیب کٹ کے نام سے مشہور تھی۔ وہ جب اس لباس میں یونیورسٹی آتا تو وہ شیخ مجیب کے چیلے طفیل احمد اور عبدالرب جیسا لگتا۔ متوسّط طبقہ کے نوجوانوں میں یہ لباس بہت مقبول تھا۔ یہ سستا بھی تھا اور ہلکا پھلکا بھی، اس لیے کم پیسے میں بڑی آسانی سے بن جاتا تھا، لیکن دوسرے بہاری لڑکے

اس لباس میں شاذ و نادر ہی نظر آتے ۔ ان کی شکل و صورت، بول چال، عادت و اطوار کی طرح ان کے لباس سے بھی غیر بنگالیت ظاہر ہوتی، لیکن صمد کو پہچاننا بہت مشکل ہوتا ۔

اس کی وجہ اس کا گھریلو ماحول تھا ۔ اس کا گھرانہ اگرچہ غیر بنگالی تھا اور اس کا اصل تعلق گجرات کے ضلع سورت سے تھا، لیکن اس کے آبا و اجداد ایک عرصے سے کلکتے میں آباد تھے ۔ اس لیے اس کے والد نے اچھی خاصی بنگلہ سیکھ لی تھی ۔ گھر پر اردو بولی جاتی تھی، لیکن دو تین پشت قبل اس کے گھر میں گجراتی کا رواج تھا ۔ اُس کے والد شمس الحق کو شعر و ادب سے گہری دلچسپی تھی اور وہ نوجوانی میں شاعری بھی کرتے تھے، لیکن شادی بیاہ کے بعد انھوں نے شاعری ترک کر دی، البتہ ادب سے بدستور دلچسپی جاری رہی ۔ شعر و ادب سے ان کی دلچسپی کا ہی نتیجہ تھا کہ انھوں نے ٹیگور، نذرل اور سرت چندر کو اوریجنل پڑھنے کے شوق میں بنگلہ زبان سیکھی ۔ وہ اردو، ہندی، گجراتی اور انگریزی سے پہلے ہی واقف تھے، بنگلہ سیکھنے کے بعد وہ بنگلہ شعر و ادب کے ایسے شیدائی ہوئے کہ ان کا زیادہ تر وقت بنگلہ ادب کے مطالعے میں صرف ہونے لگا اور انھوں نے اپنے بچّوں کو بھی اردو اور انگریزی کے ساتھ بنگلہ پڑھانے کا فیصلہ کر لیا ۔

یہ دوسری عالمی جنگ کے فوراً بعد کا دور تھا ۔ انگریز نے ہندوستانیوں کو آزادی دینے کا وعدہ کر رکھا تھا ۔ جنگ ختم ہوتے ہی آزادی کی تحریک تیز ہو گئی تھی ۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے مسلمانوں میں پاکستان کا مطالبہ شدّت اختیار کرتا جا رہا تھا ۔ شمس الحق اسے اکثر بتایا کرتے تھے کہ ہر مسلمان نوجوان کی طرح وہ بھی مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے حامی تھے، لہٰذا قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی وہ کلکتہ سے ڈھاکہ منتقل ہو گئے اور ان کا خاندان، جو صرف میاں بیوی پر مشتمل تھا ڈھاکہ کے پھول بیڑیا اسٹیشن میں ایک ریلوے ویگن میں قیام پذیر ہوا ۔ انھوں نے جنگ کے دوران ایسٹ بنگال ریلوے میں ملازمت کر لی تھی ۔ ملک جب تقسیم ہوا تو انھوں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا ۔

شمس الحق نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ جب قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ڈھاکہ پہنچے تو انھیں رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ملی ۔ آج کا ڈھاکہ اُس دَور کے ڈھاکے سے بہت مختلف تھا ۔ شہر اتنا

چھوٹا سا تھا، جیسے کلکتے کا کوئی محلّہ۔ ڈھاکہ کے اچانک صوبائی دارالحکومت بن جانے کی وجہ سے سرکاری دفاتر کے لیے بھی پختہ عمارتیں نہیں تھیں۔ ریڈیو اسٹیشن اُس وقت ناظم الدین روڈ کے ایک انتہائی قدیم اور بوسیدہ مکان میں تھا اور آج جہاں ایڈن بلڈنگ کی فلک بوس عمارت کھڑی ہے، وہاں سکریٹریٹ ایک بہت بڑی جھونپڑی میں تھی، جو بانس اور چٹائی سے بنائی گئی تھی۔ میزیں اور کرسیاں تو درکنار سرکاری سرکُلر جاری کرنے کے لیے ٹائپ رائٹر تک نہیں تھا۔ کلرک سرکاری حکم نامے ہاتھ سے لکھ کر اور کاربن پیپر کی مدد سے نقلیں بنا بنا کر جاری کرتے تھے۔ جب حکومت کی یہ بے سروسامانی تھی تو عام لوگوں کی رہائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہندوستان سے ترکِ وطن کر کے آئے ہوئے لوگوں کو عارضی کیمپوں اور جھونپڑیوں میں بسایا گیا تھا اور جنھیں جھگیاں نہیں ملی تھیں، وہ ریلوے کے خالی ویگنوں میں پناہ گزیں تھے۔ شمس الحق کا چھوٹا سا کنبہ ایک زنگ آلود ویگن میں آباد تھا، جہاں اُنھیں ایک سال رہنا پڑا۔ اس کی پیدائش بھی اسی ویگن میں ہوئی۔

اس کی امّی اپنی ہم عمر عورتوں کو اپنے پاکستان آنے کی داستان سناتے ہوئے کہا کرتی تھیں، رات بارہ بجے انھیں اچانک دردِ زہ اٹھا۔ ریلوے یارڈ میں ان دنوں آج کی طرح بجلی کی بتیاں نہیں تھیں، ہر طرف گھُپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایسے عالم میں ان کی طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے شمس الحق بے حد گھبرا گئے، ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کریں۔ آخر کار انھوں نے اپنے نبل والے ویگن میں پناہ گزیں عزیز چودھری کو نیند سے بیدار کیا اور اُنھیں سارا ماجرا سُنایا۔

عزیز چودھری مغربی بنگال کے بدنا پور ضلع کے رہنے والے تھے اور ان کی طرح اپنا آبائی وطن چھوڑ کر نئی دنیا آباد کرنے کے لیے آئے تھے۔ وہ بڑے خدا ترس انسان تھے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ وہ بہت پریشان ہیں تو انھوں نے فوراً اپنی نوبیاہتا بیوی کلثوم کو اس کی ماں کے پاس بھیج دیا۔ انھیں بیاہ کر آئے چند ہی ماہ ہوئے تھے۔ اس لیے وہ زچگی کے اسرار و رموز سے زیادہ واقف نہیں تھیں، تاہم اس نازک موقع پر کسی عورت کا قریب ہونا تقویت کا باعث تھا۔ عزیز چودھری کی بیوی کلثوم اس کی ماں کو دلاسا دیتی رہی اور وہ دونوں رات بھر ویگن کے باہر ٹھٹھرتی ہوئی سردی

میں زچّہ اور بچّہ کے لیے دعائیں مانگتے رہے۔ شمس الحق، عزیز چودھری کی اس مدد اور ہمدردی کے لیے ان کے بے حد ممنون ہوئے۔ اِس کے بعد ان میں گہری دوستی ہوگئی، جو زندگی بھر قائم رہی۔

عزیز چودھری اور شمس الحق کے خیالات ایک جیسے تھے۔ دونوں مسلم لیگ کے پُرجوش حامی اور قائداعظم کے پرستار تھے اور نئے وطن کی تعمیر کے جذبے سے سرشار ہو کر ڈھاکہ آئے تھے اور ان کے دلوں میں نئی مملکت کی خدمت کا جذبہ موجزن تھا۔ اُس دَور میں مقامی اور غیر مقامی کا تصوّر پیدا نہیں ہوا تھا۔ سب مسلمان بھائی بھائی کی طرح تھے۔ خواہ وہ کسی بھی صوبے اور کسی بھی علاقے کا رہنے والا کیوں نہ ہو، مسلمان ہونا سب سے اہم بات تھی۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد بنگالی مسلمانوں نے ہندوستان سے ترکِ وطن کر کے آنے والے مہاجروں کا پُرتپاک خیر مقدم کیا تھا اور اپنے دلوں کے دروازے کھول دیے تھے۔ ڈھاکہ، چاٹگام، کھُلنا، جیسور، اِلیشرڈی، شانتاہار، پاربتی پور اور سیدپور میں بہار، یوپی اور مغربی بنگال سے آنے والے مہاجروں کے استقبال اور ان کی بحالی کے لیے ریلیف کمیٹیاں قائم کر دی گئی تھیں۔ یہ کمیٹیاں مہاجروں کا استقبال کرتیں، اُنھیں کپڑے اور ضروری سامان فراہم کرتیں اور چند روز کیمپوں میں رکھنے کے بعد اُن کے لیے بنائی ہوئی جھونپڑیوں میں منتقل کر دیتیں۔ شمس الحق، جب صمد سے اس دَور میں مہاجروں اور انصاروں کے درمیان پائی جانے والی محبّت اور بھائی چارے کا ذکر کرتے تو اُسے یقین نہ آتا۔

ایئر ہوسٹیس نے اسے ایک ٹرے میں ناشتہ لا کر تھما دیا اور دوسرا ٹرے اس کی ماں کی جانب بڑھایا۔ اس کی امّی ابھی تک سوئی ہوئی تھیں، ایئر ہوسٹیس کی آواز سُن کر خواب سے بیدار ہو گئیں اور حیرت سے اُس کی جانب دیکھنے لگیں۔ سنہری زلفوں والی خوبصورت برطانوی لڑکی نیلے یونیفارم میں کسی ملک کی شہزادی لگ رہی تھی۔ اس کی امّی اُسے اس طرح تک رہی تھیں جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہوں۔

وہ بھی اس خوبصورت ایئر ہوسٹیس کی جانب دیکھ رہا تھا اور اس کی نظروں کے سامنے رقیّہ کی شکل گھوم رہی تھی۔ رقیّہ کو اگر یہ یونیفارم پہنا دیا جاتا اور اس کے سر کے بالوں کو اِسی طرح سجا دیا

جاتا تو وہ بھی اس انگریز لڑکی سے کم خوبصورت نہیں لگتی۔ رقیہؔ نے ایک بار اس سے از راہِ مذاق کہا تھا۔

"میں ایم، اے کرنے کے بعد پی۔ آئی۔ اے میں ایئر ہوسٹیس بن جاؤں گی۔"

"ناممکن، فوراً ڈِس کوالی فائی کر دی جاؤ گی۔"

"کیوں؟ کیا میں ایئر ہوسٹیس نہیں بن سکتی؟"

"ضرور بن سکتی ہو، لیکن اس کے لیے بنگلہ اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو جاننا بھی ضروری ہے اور تم اردو سے بالکل نابلد ہو۔"

"اردو سیکھنا کون سا مشکل کام ہے۔ چند مہینوں میں سیکھ لوں گی" اس نے مردوں کی طرح چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ تم مجھے اردو پڑھاؤ گے۔ تم جب بنگلہ سیکھ کر فر فر بول سکتے ہو تو میں اردو سیکھ کر کیوں نہیں بول سکتی؟ اور پھر میں نے اردو فلمیں دیکھنی شروع کر دی ہیں۔ میں اردو گانے بھی سیکھ رہی ہوں۔ کیا میں اِس طرح چند مہینوں میں اردو نہیں سیکھ سکتی؟" اس نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"کیوں نہیں؟ اگر کوشش کرو تو ضرور سیکھ سکتی ہو۔"

رقیہؔ کو اس کا احساس تھا کہ وہ جتنی اچھی بنگلہ جانتا ہے وہ اتنی اچھی اردو نہیں جانتی، بلکہ وہ اردو جانتی ہی نہیں۔ اس نے اس سے بارہا اردو پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تھی جسے وہ مذاق سمجھ کر ٹالتا رہا، لیکن جب اس کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو وہ اسے اردو پڑھانے کے لیے رضامند ہو گیا۔ وہ بازار سے اردو بنگلہ قاعدہ لے آیا اور رقیہؔ کو باقاعدگی سے پڑھانا شروع کر دیا۔ رقیہؔ کو اردو سیکھنے میں اردو نغموں سے بڑی مدد ملی۔ اسے موسیقی سے بچپن سے لگاؤ تھا اور اس نے عام بنگالی لڑکیوں کی طرح موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ اسے پاکستانی اور ہندوستانی

نغموں سے بھی دلچسپی تھی۔ اس نے ریڈیو پر لتا، فردوسی، نور جہاں اور رونا لیلیٰ کے فلمی نغموں سے بہت سے اردو الفاظ سیکھ لیے تھے۔ وہ دونوں جب یونیورسٹی سے جلد فارغ ہو جاتے تو ریس کورس یا رمنہ گرین کی جانب نکل پڑتے اور جھیل کے کنارے کسی سایہ دار درخت کے نیچے آکر بیٹھ جاتے۔ رقیہ اپنے وینٹی بیگ سے اردو کا قاعدہ نکال کر بیٹھ جاتی۔ وہ اسے ایک دو سبق دیتا اور پھر اس سے اردو گانے سنانے کی فرمائش کرتا۔ اردو گانا اُس کی تعلیم کا حصّہ ہوتا۔ وہ اس میں استعمال ہونے والے مشکل الفاظ کے معنی بتاتا اور تلفّظ درست کرتا۔

رقیہ واقعی بہت اچھا گاتی تھی۔ اس کی آواز بے حد سُریلی تھی۔ وہ جب رَوِیندر سنگیت گاتی تو ایسا محسوس ہوتا، جیسے سُمِترا سین گا رہی ہے۔ وہ رَوِیندر سنگیت کا بے حد شیدائی تھا اور اُس سے عموماً روبی ٹھاکر کے نغمے سنانے کی فرمائش کرتا تھا، جب کہ رقیہ اردو گانے کو ترجیح دیتی تھی اور بے حد لہک لہک کر لتا، نور جہاں اور رونا کے گانوں کی نقلیں اتارتی تھی۔

رقیہ ڈھاکہ یونیورسٹی کی اُن طالبات میں سے تھی، جو ابتدا سے اِیسٹو کی سرگرم کارکن رہی ہیں۔ اس نے ایڈن گرلز کالج میں سب سے پہلے اسٹوڈنٹس یونین کی شاخ قائم کی تھی اور اسٹوڈنٹس تحریک میں حصّہ لے کر بڑا نام پیدا کیا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں آمریت کے خلاف اور جمہوریت کی بحالی کی تحریک میں جن طلبا نے سرگرم حصّہ لیا تھا اور منعم خان کی پولیس کی لاٹھیاں کھائی تھیں، ان میں وہ دونوں بھی شامل تھے۔ اُس وقت وہ قائداعظم کالج میں سیکنڈ ایئر میں تھا اور رقیہ ایڈن گرلز کالج کے فرسٹ ایئر میں۔ رقیہ اس وقت سے ہی سیاست سے گہری دلچسپی لینے لگی تھی۔

اتنی کم عمری میں سیاست سے دلچسپی لینے کی اصل وجہ اس کے گھر کا ماحول تھا۔ اس کا پورا خاندان سیاست زدہ تھا۔ اس کے والد عبدالعزیز چودھری مشہور صحافی اور مولانا اکرم خاں کے اخبار "آزاد" کے سینئر رپورٹر تھے۔ اُس کی ماں کلثوم چودھری عورتوں کے مشہور ہفت روزہ "بیگم" کی پرانی مضمون نگار تھیں۔ گھر پر بنگلہ اور انگریزی کا کوئی ایسا اہم اخبار یا جریدہ نہیں تھا، جو نہ آتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ خود عبدالعزیز چودھری کو سیاست

سے گہری دلچسپی تھی۔ رقیہؔ کی ذہنی نشوونما اسی ماحول میں ہوئی تھی۔

غیر بنگالی طلبا سیاسی سرگرمیوں سے عموماً الگ تھلگ رہتے اور اگر حصہؔ لیتے بھی تو سرکاری تنظیم این، ایس، ایف یا اسلامی چھاترو شنگھو کی سرگرمیوں میں۔ اسلام کا نام ان کے لیے بڑی کشش رکھتا اور وہ پاکستان کے اتحاد اور اسلام کی بقا کے نام پر اپنی جانیں تک قربان کرنے کے لیے تیار رہتے۔ غیر بنگالی طلبا میں بہت کم ایسے تھے جو ایپسو یا اسٹوڈنٹس لیگ میں شامل تھے۔ ان کے بزرگوں نے ان کے ذہن میں یہ بات بٹھادی تھی کہ طلبا کی یہ دونوں تنظیمیں بہاریوں کی مخالف اور پاکستان کے مفاد کے خلاف کام کر رہی ہیں۔

اس کا نہ این۔ایس۔ایف سے تعلق تھا اور نہ اسلامی چھاترو شنگھو سے۔ وہ ابتدا سے ہی اپنے بنگالی دوستوں کے ساتھ ایپسو میں سرگرم حصہؔ لیتا رہا تھا اور کالج کے انتخاب میں اُسی کی جانب سے کام کرتا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی قائداعظم کالج کا انتخاب ہوتا وہ اسٹوڈنٹس یونین کی جانب سے کسی نہ کسی عہدہ کے لیے ضرور منتخب کیا جاتا۔ وہ عام بہاری طلبا سے مختلف ہونے کی وجہ سے بنگالی طلبا میں بہت مقبول تھا اور ایپسو کے حلقوں میں اس کی کافی شہرت تھی۔ اُس پر اُس کے والد کا گہرا اثر تھا۔ وہ خود بھی بڑے انقلابی واقع ہوئے تھے اور انھوں نے اُسے اپنے خیالات کے سانچوں میں ڈھالا تھا۔ وہ مسلم لیگ کی سیاست سے بیزار ہو چکے تھے، جس کے نتیجے میں اُن کے خیالات میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ وہ اب کھلّم کھلا سوشلزم کی باتیں کرنے لگے تھے اور ان کے زیرِ اثر وہ بھی انقلاب کی باتیں کرنے لگا تھا۔

صمد اپنے انقلابی خیالات، تنظیمی صلاحیت اور اندازِ خطابت کی وجہ سے بہت جلد طلبا کے حلقوں میں مقبول ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شہرت کالج کی چہار دیواری سے نکل کر سارے ڈھاکے اور پھر سارے صوبے میں پھیل گئی۔ بی۔اے فائنل میں پہنچنے تک وہ ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس یونین کی جنرل کونسل کا رکن بن چکا تھا اور وہ سارے صوبے میں طالب علم رہنما کے طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔

وہ رقیہؔ چودھری سے یوں تو بہت دنوں سے واقف تھا اور اِیپسُو کے اجلاس اور پھر جنرل کونسل کے انتخاب کے دوران اُس سے مل چکا تھا، لیکن اس سے قربت یونیورسٹی میں آنے کے بعد پیدا ہوئی۔ وہ ایڈن گرلز کالج سے آئی تھی اور اس کے شعبے میں داخلہ لیا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ بھی اِیپسُو کی جنرل کونسل کی رکن تھی اور طلبا کے حلقوں میں صمد کی شہرت کی وجہ سے اس سے دلچسپی لینے لگی تھی۔ اس کے شعبے میں دو ایسے استاد تھے، جو اپنے سیاسی نظریات کی وجہ سے یونیورسٹی کے علاوہ سیاسی حلقوں میں بھی مشہور تھے۔ اُن میں ایک پروفیسر مظفر احمد چودھری اور دوسرے رحمٰن سبحان تھے۔ ان کی تحریروں نے بنگالی نوجوانوں، خصوصاً دانشور طبقے کو بہت متاثر کیا تھا، وہ جب لیکچر دیتے تو ان کی کلاس طلبا سے بھری رہتی اور لیکچر کے دوران کلاس روم میں قطعی خاموشی چھائی رہتی۔ طلبا ہمہ تن گوش ہو کر ان کی لیکچر سنتے اور وہ جب سوالات کرنے کی اجازت دیتے تب طلبا ان سے سوالات کرتے۔

پہلے دن جب پروفیسر چودھری سے اُس کا تعارف کرایا گیا اور انھیں معلوم ہوا کہ وہ بہاری ہوتے ہوئے بھی بنگالیوں کی طرح فر فر بنگلہ بولتا ہے اور وہ ان کے کاز کا حامی ہے تو پروفیسر چودھری کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور اس کے خیالات کو سراہا۔ اُنھیں آج تک کیسی ایسے بہاری طالب علم سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، جس نے بنگالیوں کے مطالبات کی اس طرح جوش و خروش سے حمایت کی ہو۔ وہ چند ہی دنوں میں پروفیسر چودھری اور پروفیسر سبحان کا محبوب شاگرد بن گیا اور اس طرح اس نے ساری یونیورسٹی کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ وہ صرف سرگرم اسٹوڈینٹس لیڈر ہی نہیں، ذہین طالب علم بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اسے ملک گیر شہرت حاصل ہو گئی اور قومی اخبارات میں اس کا نام باقاعدگی سے آنے لگا۔ کالج کے پروفیسروں سے لے کر وائس چانسلر تک اس سے شفقت کے ساتھ پیش آنے لگے اور سب سے بڑی بات یہ کہ رقیہؔ بھی اُس کی پُرکشش شخصیت سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔

اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں، جن سے کوئی بھی لڑکی اس کی جانب مائل ہو سکتی تھی۔ اس پر اس کی ذہانت اور خطابت نے اس کی شخصیت کو مزید دلکشی بخش دی تھی۔ اسی لیے رقیہؔ اُس کی جانب غیر ارادی طور پر کھنچی چلی آ رہی تھی۔ پہلے وہ اُس سے بہت محتاط انداز میں ملتا تھا اور کلاس میں سوائے ضروری باتوں کے اُس سے بہت کم باتیں کرتا تھا، لیکن جب رقیہؔ نے خود اُس سے بے تکلفانہ انداز میں گفتگو شروع کی تو اُسے بھی تکلفات کو خیرباد کرنا پڑا اور وہ رفتہ رفتہ بے تکلف ہو گئے۔

رقیہؔ جب لیزر پیریڈ میں اس سے ایک ساتھ اِسٹڈی کرنے یا اس کے ساتھ یونیورسٹی لائبریری چلنے کے لیے کہتی تو وہ انکار نہ کر پاتا اور خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیتا۔ وہ بعض اوقات لائبریری جانے کے بجائے آرٹس فیکلٹی کے تاریخی بٹ تلہ (برگد کے درخت) کے نیچے بیٹھ کر پڑھنے لگتے، جو طلبا کی جلسہ گاہ کے طور پر مشہور تھا اور جہاں عام دنوں میں خاموشی چھائی رہتی تھی۔ ان کا جب پڑھتے پڑھتے دل اُکتا جاتا تو وہ سیر کے لیے رمنہ پارک یا ریس کورس کی جانب نکل پڑتے یا پھر چپکے سے "بلا کا سنیما" میں گھس جاتے، جو یونیورسٹی کے بالکل قریب واقع تھا۔

رقیہؔ نے ایک دن اس سے اپنی عجیب و غریب خواہش کا اظہار کیا۔

اس نے کہا: "میں تمہاری امّی سے ملنا چاہتی ہوں"۔

اُس کے اس اعلان پر وہ گھبرا گیا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ رقیہؔ کے اس طرح گھر جانے سے کہیں اس کے ابّو اور امّی اس کے بارے میں کچھ سمجھ نہ لیں۔ وہ رقیہؔ کو ٹالنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ رقیہؔ بہ آسانی ٹلنے والی نہیں تھی۔ اس کے اصرار کرنے پر وہ اسے اپنے گھر لے جانے پر مجبور ہو گیا۔

وہ جب اسے اپنے گھر لے کر پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ شمس الحق صحن میں بیٹھے ریڈیو پر خبریں سُن رہے تھے اور اس کی امّی ان کے قریب مونڈھے پر بیٹھی سوئٹر بننے میں مصروف تھیں۔ اس کے

ابّو اور امّی اس کے ساتھ ایک اجنبی لڑکی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ رقیہؔ نے جھک کر بڑے ادب سے سلام کیا۔ صمد نے ان سے رقیہؔ کا تعارف کرایا۔

"ابّو، یہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ اس کے ابّو مشہور صحافی عزیز چودھری ہیں۔ یہ آپ لوگوں سے ملنے کی خواہش مند تھی اس لیے اسے ساتھ لے آیا۔"

"کون عزیز چودھری؟ "آزاد" کے چیف رپورٹر تو نہیں؟"

"جی، وہی، کیا آپ انھیں پہچانتے ہیں؟"

یہ سُنتے ہی شمس الحق خوشی سے اُچھل پڑے اور اس کی امّی حیرت سے رقیہؔ کو دیکھنے لگیں۔

"آؤ، بیٹی آؤ، یہاں بیٹھو" شمس الحق نے اپنے قریب رکھے ہوئے خالی مونڈھے کی جانب اشارہ کیا۔

"صمد کی ماں، تم نے اسے پہچانا؟ ارے یہ اپنے عزیز میاں کی بیٹی رُقّو ہے۔ ماشاء اللہ کتنی بڑی ہوگئی ہے۔"

اس کی امّی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ انھوں نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، "ماشاء اللہ! ہماری بٹیا کافی بڑی ہوگئی ہے۔ بڑے عرصے کے بعد میں نے اسے دیکھا ہے۔ یہ تو ہمیں پہچانتی بھی نہ ہوگی۔ کیوں؟ ٹھیک ہے نا؟"

رقیہؔ حیرت سے ان کی جانب دیکھ رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس موقع پر کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ صمد بھی حیرانی سے اُن کی جانب تک رہا تھا اور غیر متوقع صورتِ حال پر دنگ تھا۔

اس کی امّی کہہ رہی تھیں، "میں نے جب اُسے پہلی بار دیکھا تو ایسا محسوس ہوا، جیسے کلثوم سامنے آگئی ہو، بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔ وہی شکل و صورت اور وہی ڈیل ڈول۔ بیٹی، تم نے ہمیں پہچانا؟"

رقیہؔ نے نفی میں سر ہلایا اور نگاہیں نیچی کرلیں۔ یونیورسٹی لان میں سرپٹ دوڑنے والی اور پلٹن میدان میں شعلے برسانے والی لڑکی سر پر آنچل ڈالے اس طرح خاموش کھڑی تھی، جیسے ابھی ابھی بیاہ کر آئی ہو۔

شمس الحق نے کہا "کمال کر رہی ہو صمد کی ماں، ہم لوگوں نے جب پلاسی بیرک چھوڑا تھا اس وقت رُقوؔ پانچ سال کی تھی۔ بھلا وہ ہمیں کس طرح یاد رکھ سکتی ہے؟ اچھا بیٹی یہ بتاؤ، تمھارے ابّو اور امّی خیریت سے تو ہیں نا؟"

"جی ہاں، ابّو خیریت سے ہیں، لیکن امّی ہمیشہ بیمار رہتی ہیں۔ ان کی بینائی بہت کمزور ہو چکی ہے۔"

شمس الحق، رقیہؔ سے عزیز چودھری سے اپنی دیرینہ دوستی کا ذکر کرتے رہے اور صمد کی امّی چلئے بنانے کے لیے اندر چلی گئیں شمس الحق نے اس کے ابّو کے خلوص اور محبّت کی تعریف کرتے ہوئے رقیہؔ کو بتایا کہ تقسیم کے وقت وہ دونوں کلکتے سے کس طرح ڈھاکہ آئے اور کس طرح پرانے ڈھاکے کے پھول بیڑیا اسٹیشن میں ایک سال تک ویگن میں گذارا۔ ریلوے ویگن سے نکل کر دونوں نے پلاسی بیرک میں ایک ہی جگہ مکان لیا اور کئی سال ایک ساتھ رہے۔ اس دوران دونوں خاندانوں میں گہرے مراسم پیدا ہو گئے۔ پلاسی بیرک میں آتے ہی انھوں نے ریلوے کی ملازمت ترک کر دی اور انھیں سکریٹیریٹ میں ملازمت مل گئی اور اس کے والد نے مولانا اکرم کے اخبار "آزاد" میں ملازمت کر لی۔ اس کے بعد عزیز میاں کے ہاں وہ پیدا ہوئی۔

رقیہؔ کی پیدائش کے وقت صمد کی امّی بڑی مددگار ثابت ہوئیں۔ ڈھاکہ میں عزیز چودھری یا اس کی امّی کا کوئی قریب یا دور کا رشتہ دار موجود نہیں تھا اور نہ شہر میں آج کی طرح کوئی بڑا اسپتال تھا، لہٰذا گھر پر ہی زچگی کا انتظام کرنا پڑا۔ رقیہؔ کی امّی جب تک صحت یاب نہیں ہوئیں، عزیز میاں اور اس کی امّی کے لیے شمس الحق کے گھر سے تینوں وقت کھانا جاتا رہا۔ اس پر اس کے ابّو اور امّی نے اعتراض بھی کیا، لیکن ان کی ایک نہ سُنی گئی۔ رقیہؔ کی پیدائش کے بعد دونوں گھرانے

اور بھی قریب آگئے۔ رقیہؔ کی امّی کا زیادہ تر وقت صمد کی امّی کے ہاں گزرتا۔ عزیز چودھری اور شمس الحق کے دفتر جانے کے بعد دونوں عورتیں تنہا رہ جاتیں، رقیہؔ کی امّی اسے گود میں لے کر ان کے ہاں آجاتیں اور شام تک وہیں رہتیں۔ ان کے گھروں کے درمیان صرف ایک پتلی سی دیوار کھڑی تھی۔ وہ جس مکان میں رہتے تھے وہ بہت بڑی عمارت تھی، جسے درمیان سے دیوار کھڑی کر کے گھر تقسیم کر دیا گیا تھا۔ شمس الحق نے جب محسوس کیا کہ عزیز چودھری اور رقیہؔ کی امّی کو ان کے ہاں آنے جانے میں دِقّت ہوتی ہے تو انھوں نے دیوار کو ڈھا دیا۔ اس طرح دونوں گھر آپس میں مل کر ایک ہو گئے۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد شمس الحق، عزیز چودھری کی بیٹھک میں آجاتے، جہاں ان کے درمیان رات گئے تک شطرنج کی محفل جمی رہتی یا پھر ان میں ملکی اور غیر ملکی سیاست پر گرما گرم بحثیں جاری رہتیں۔

انھوں نے اس طرح پانچ سال کا طویل عرصہ ایک ساتھ گزار دیا، دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ہاں کئی بچّے پیدا ہوئے اور کئی اللہ کو پیارے ہو گئے اور جو زندہ بچے وہ دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ہو کر کھیلنے کودنے لگے۔ اس عرصے میں ان کے درمیان کبھی لڑائی یا ناانفاقی نہیں ہوئی، جس پر ان کے پڑوسیوں کو بھی تعجب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب شمس الحق کو ڈھاکے سے سات میل دور مہاجروں کی بستی محمد پور ہاؤسنگ اسٹیٹ میں مکان الاٹ ہوا اور انھوں نے وہاں منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تو سب سے زیادہ جسے افسوس ہوا وہ رقیہؔ کی امّی تھیں۔ رقیہؔ اور صمد کی ماؤں کے درمیان حقیقی بہنوں جیسی محبّت تھی۔ شمس الحق کو محمد پور میں مکان الاٹ ہونے کی وجہ سے مجبوراً ان سے جدا ہونا پڑا۔ عزیز چودھری کو بھی شمس الحق کے جانے کا افسوس تھا۔ لیکن انھوں نے نئے مکان میں جانے سے اس لیے نہیں روکا کہ انھیں معلوم تھا کہ وہ کلکتہ میں اپنا آبائی مکان چھوڑ کر آئے ہیں، اس لیے اگر انھیں از سرِ نو گھر ملا ہے تو اسے ہاتھ سے نہیں گنوانا چاہیے۔ یوں تو عزیز چودھری بھی مغربی بنگال کے مہاجر تھے اور انھوں نے بھی پاکستان کی محبّت میں اپنا آبائی گاؤں چھوڑا تھا لیکن انھیں ابھی تک حکومت کی طرف سے زمین یا مکان الاٹ نہیں ہوا تھا۔

عزیز چودھری اپنے دوست کو نئے گھر میں آباد ہوتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش تھے اور انھوں نے بڑی خوشی کے ساتھ شمس الحق کو رخصت کیا تھا۔

شمس الحق کے محمد پور جانے کے بعد بھی دونوں گھرانوں کا کچھ دنوں تک ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا رہا، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اور ان کی مصروفیات بڑھتی گئیں، ان کی آمد و رفت میں کمی ہوتی گئی اور پھر ایک دن شمس الحق کو ترقی دے کر کھلنا منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح عزیز چودھری کے گھرانے سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ یہ بہت دن پہلے کی باتیں تھیں۔ وہ اس وقت گورنمنٹ سروس میں تھے، لیکن اب وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے تھے۔ رقیہؔ کو دیکھ کر انھیں عزیز چودھری کے ساتھ گزارے ہوئے دن یاد آ گئے اور وہ اُسے تمام تفصیلات بتاتے رہے۔ شمس الحق نے رقیہؔ سے کہا، "تمہارے ابّو سے ملے ایک عرصہ ہو چکا ہے، اُن سے کہنا میں اُن سے ملنے کا بڑا خواہش مند ہوں۔ آئندہ اتوار کو تم اپنے ابّو اور امّی کو یہاں لے آنا اور رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا، کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"جی" رقیہؔ اس پر رضامند ہو گئی۔

رقیہؔ نے گھر پہنچتے ہی اپنے ابّو اور امّی کو صمد اور شمس الحق کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ عزیز چودھری اپنے دیرینہ دوست کے بارے میں سُن کر بہت خوش ہوئے اور آئندہ اتوار کو شمس الحق کے ہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی امّی بھی بہت دیر تک صمد کے ابّو اور امّی کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ اتوار کے روز ٹھیک پانچ بجے رقیہؔ، اپنے ابّو اور امّی کے ساتھ اُن کے ہاں پہنچ گئی۔ دونوں بچھڑے ہوئے دوست مل کر اس قدر خوش ہوئے کہ رو پڑے۔ رقیہؔ کی ماں کا بھی یہی حال ہوا۔ پھر وہ چاروں آپس میں باتیں کرنے میں اس طرح کھو گئے کہ انھیں رقیہؔ اور صمد کی موجودگی کا بھی احساس نہ رہا۔ اس کی امّی رقیہؔ کی امّی کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ صمد اور رقیہؔ کچھ دیر شمس الحق اور عزیز چودھری کی باتیں سنتے رہے، پھر صمد دونوں بوڑھوں کو چھوڑ کر چپکے سے رقیہ کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا آیا اور اُسے اپنی کتابیں دکھاتا رہا۔

شمس الحق اور عزیز چودھری کی دوبارہ ملاقات نے ان کی دوستی کو ایک بار پھر زندہ کر دیا اور صمد اور رقیہ کی ایک دوسرے کے ہاں آمد و رفت نے انھیں اور بھی قریب کر دیا ۔ دونوں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے تھے۔ عزیز چودھری نے اگرچہ "آزاد" سے علیحدگی اختیار نہیں کی تھی اور وہ اب بھی اُس کے پے رول میں تھے، لیکن انھوں نے اپنے دفتر جانے کے بجائے ہفتہ وار کالم لکھنا شروع کر دیا تھا۔ "آزاد" کے صفحات پر ہر اتوار کو قومی امور پر ان کا سیاسی تبصرہ شائع ہوتا، جو سیاسی اور اخباری حلقوں میں قدر کی نظروں سے دیکھا جاتا۔ انھوں نے فوجی آمریت کے خلاف اور جمہوریت کی بحالی کے حق میں اتنی شدّت سے آواز بلند کی کہ کئی بار وزارت اطلاعات کی طرف سے اخبار کی انتظامیہ کو خبردار کیا گیا، اس کے باوجود ان کے انداز اور لب و لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور وہ بنگالیوں کے حقوق اور جمہوریت کی بحالی کی حمایت میں اسی شدّ و مد سے لکھتے رہے۔

اسی دوران مغربی پاکستان میں ایوب خاں کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایوب خاں نے ان مظاہروں کو سختی سے کچلنا چاہا، جس کا اُلٹا نتیجہ نکلا اور سارے ملک میں فوجی آمریت کے خلاف غیظ و غضب کی لہریں پھیل گئیں۔ اس آگ نے مشرقی پاکستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مشرقی پاکستان میں اس تحریک نے اتنی شدّت اختیار کی کہ فوجی آمریت کی بنیادیں ہل گئیں۔ اُس دَور میں فوجی آمریت کے خلاف طلبا کی تحریک کی قیادت جن اسٹوڈینٹس لیڈروں نے کی، ان میں صمد اور رقیہ چودھری بھی شامل تھے۔ انھوں نے منعم خاں کی پولس کی لاٹھیاں بھی کھائیں اور اشک آور گیس کے گولے بھی سہے، لیکن پسپائی اختیار نہیں کی۔ آمریت کے خلاف عوامی تحریک میں حصّہ لینے کے جرم میں رقیہ چودھری، صمد اور دوسرے کئی طالب علم رہنماؤں کے نام وارنٹ جاری ہو گئے اور وہ روپوش ہو کر تحریک کی قیادت کرتے رہے اور اس وقت تک کرتے رہے، جب تک کہ عوامی تحریک کو کچلنے کے لیے دوسری بار مارشل لا نافذ نہیں کیا گیا۔ اس تمام عرصے میں

رقیہ اور صمد کو عزیز چودھری اور شمس الحق کی سرپرستی حاصل رہی۔

اس کی امّی کے پانی طلب کرنے پر وہ اپنے خیالات سے چونک پڑا۔

اُس نے ایئر ہوسٹیس کو بلا کر پانی لانے کے لیے کہا۔ اس کی امّی خواب سے بیدار ہو چکی تھیں اور بڑی حیرت سے طیارے کے مسافروں کو دیکھ رہی تھیں، جن کا چہرہ پاکستان جانے کی خوشی میں دمک رہا تھا۔ بنگلہ دیش سے روانگی کے وقت ان کے چہروں پر جو اداسی تھی وہ اب دُور ہو چکی تھی۔

صمد نے سوچا۔

اس عرصے میں دیکھتے ہی دیکھتے کتنے طوفان گزر گئے اور ان طوفانوں نے کتنے لوگوں کی زندگی کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا، جو لوگ ۲۴ سال سے انتہائی آرام و سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے، اب ماچس کے تنکوں کی طرح بکھر چکے ہیں اور حالات کا دھارا انھیں مغربی پاکستان بہا کر لے جا رہا ہے، جو لوگ وہاں رہ گئے ہیں وہ زندگی کی اذیتوں سے بچنے کے لیے باری تعالیٰ سے موت کی بھیک مانگ رہے ہیں۔

اس نے اپنی چھوٹی سی عمر میں بہت کچھ دیکھا، تاریخ کی سب سے ہولناک خانہ جنگی دیکھی، بے شمار لوگوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح مرتے ہوئے دیکھا۔ قتل و غارت، لوٹ مار اور آتشزنی کے اتنے واقعات دیکھے کہ اب اُن میں اس کے لیے کوئی ہیبت نہیں رہی۔ مارشل لا کے نفاذ اور ایوب خاں کے زوال کے بعد سیاسی سرگرمیاں عارضی طور پر معطل ہو گئیں۔ اس نے اور رقیہ نے تعلیم کی جانب پھر سے توجہ مبذول کر دی اور ان کی سرگرمیاں صرف یونیورسٹی تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد ہونے کے باوجود عوام میں علاقائی خود مختاری کا مطالبہ شدّت اختیار کرتا گیا۔ بہاریوں نے اس مطالبے کی شدّت سے مخالفت کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگالیوں نے انھیں اپنا دشمن سمجھ لیا، لیکن صمد، شمس الحق اور ان کی طرح دوسرے سنجیدہ لوگ اس رویّے کو غلط سمجھتے رہے اور اس کی کھُل کر مذمت کی، لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی،

اتنی کم کہ ان کا کوئی شمار نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بہاریوں میں انھیں حقارت کی نظروں سے دیکھا گیا۔ بہاری عوام کی اکثریت جاہل اور پس ماندہ تھی۔ ان میں سیاسی شعور نام کے لیے بھی نہیں تھا، اس پر مغربی پاکستان کے اخبارات نے انھیں مزید گمراہ کر دیا تھا۔ صمد اور شمس الحق نے بہاریوں کے طعن و تشنیع کی کبھی پروا نہیں کی اور ان کی کھل کر مذمت کرتے رہے۔

جنوری ۱۹۷۰ء میں سیاسی سرگرمیوں کی اجازت ملتے ہی ڈھاکہ کی سڑکیں ایک بار پھر فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھیں اور وہ رقیہ کے ساتھ پھر طلبا کی تحریک میں شامل ہو گیا۔ یہ اس کا یونیورسٹی میں آخری سال تھا۔ عام انتخابات کی تاریخ کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ صورتِ حال بالکل بدل چکی ہے، بائیں بازو کی ترقی پسند جماعتوں کی جگہ عوامی لیگ نے کافی مقبولیت حاصل کر لی ہے اور دائیں بازو کی جماعتوں نے باہم گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ سیاسی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی اور دوسرے کالجوں میں ایپسو اپنی مقبولیت گنواتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ چھاترو لیگ تیزی سے ابھر رہی ہے۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ طلبا کی قیادت ایپسو کے ہاتھ سے نکل کر چھاترو لیگ کے ہاتھ میں جا چکی ہے۔ عام انتخابات کا وقت جوں جوں قریب آتا گیا۔ بائیں بازو کی جماعتوں اور طلبا کی تنظیموں میں انتشار بڑھتا گیا۔ آخر کار ایک ایسا دور بھی آیا جب ترقی پسند طلبا کی تنظیم ایپسو چار حصّوں میں بٹ گئی اور وہ ایک تماشائی بن کر رہ گیا۔

حالات تیزی سے رُخ بدلنے لگے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ بنگالیوں اور غیر بنگالیوں میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ یہ کشیدگی اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب یحییٰ خاں نے یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا۔ ریڈیو پر اعلان سنتے ہی عوام بپھر گئے اور لاٹھیاں، آہنی سلاخیں، نیزے اور رام دا لے کر سڑکوں پر نکل آئے اور چیختے چلاّتے اور احتجاجی نعرے لگاتے رہے۔ اس مظاہرے میں طلبا کی دوسری تنظیموں کے ساتھ ایپسو بھی شامل تھی۔ اس کا مرکزی جلوس ڈھاکہ یونیورسٹی کے بٹ تلہ سے نکل کر بیت المکرم کے سامنے

آکر رُک گیا تھا۔ دوسرے احتجاجی جلوس رات بھر ڈھاکہ کی سڑکوں پر گشت کرتے رہے تھے۔

شام ہوتے ہی مشتعل ہجوم نے بیت المکرم اور جناح ایونیو میں غیر بنگالیوں کی دُکانوں پر حملے شروع کر دیے اور انھیں لوٹنے کے بعد نذرِ آتش کر دیا، جس سے غیر بنگالیوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ عزیز چودھری کو جب ہنگامے کا علم ہوا تو وہ فوراً رکشے میں شمس الحق کے گھر پہنچ گئے اور انھیں ہر قسم کی مدد کا یقین دلایا۔ سیاست کے بدلے ہوئے دھارے سے شمس الحق اور عزیز چودھری بہت پریشان تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ تحریک کے فرقہ وارانہ رنگ اختیار کرنے پر رقیہؔ اور صمد بھی بہت پریشان تھے، لیکن حالات ان کے اختیار میں نہیں تھے، جلسے اور جلوس سے واپسی پر وہ روز رقیہؔ کو چھوڑنے اس کے گھر جاتا اور عزیز چودھری سے شہر کی صورتِ حال پر باتیں کرتا رہتا۔

دو تین دنوں میں ڈھاکہ میں فرقہ وارانہ فسادات پر قابو پا لیا گیا لیکن کشیدگی دور نہیں ہوئی اور بداعتمادی اور عدم تحفّظ کا احساس بڑھتا گیا۔ ۱۵ مارچ سے سارے مشرقی پاکستان میں عدم تعاون کی تحریک شروع ہو گئی۔ صوبے بھر میں احتجاج کے طور پر سیاہ پرچم لہرانے کا فیصلہ کیا گیا، لیکن بہاریوں نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کے خیال میں گھروں پر سیاہ پرچم لہرانا پاکستان سے غدّاری کے مترادف تھا۔ سارے صوبے میں سیاہ پرچم لہرایا گیا۔ اگر کہیں نہیں لہرایا گیا تو وہ بہاریوں کے محلّوں میں۔ ان باتوں نے کشیدگی میں مزید اضافہ کر دیا اور دونوں جانب طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں۔ فرقہ وارانہ کشیدگی اُس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب ۲۳ مارچ کو یومِ پاکستان کے موقع پر یومِ سادھن بنگلہ دیش منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس دن سے صوبے کے مختلف حصّوں میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے، جس نے ۲۵ مارچ کو خطرناک صورت اختیار کر لی۔

اسے آج بھی ۲۵ مارچ کی وہ ہیبت ناک رات یاد ہے۔ جب شہر میں کشیدگی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ لوگ کئی دنوں سے رات کو جاگ کر محلّوں میں پہرے دے رہے تھے۔ صبح سے ہی لوگ سہمے ہوئے

سے تھے۔ مختلف قسم کی ہیبت ناک افواہیں گشت کر رہی تھیں، ریڈیو پاکستان نے رات کی بلیٹن میں یحییٰ، مجیب اور بھٹو مذاکرات کی ناکامی کا اعلان کر دیا تھا۔ لوگوں کے دل ملول و افسردہ تھے اور ہر شخص آنے والے واقعات کے خیال سے مضطرب تھا کہ نصف شب کے وقت اچانک محمد پور کی تمام بتیاں بجھ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں نے ٹیلی فون اور بجلی کے کھمبے بجانے شروع کر دیئے۔ اسی کے ساتھ ہر طرف سے اللہ اکبر اور جیئے بنگلہ کے نعرے بلند ہونے لگے۔ لوگ لاٹھیوں، تلواروں اور چھروں سے لیس ہو کر اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور گروہ کی شکل میں مقابلے کی تیاریاں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں بندوقیں اور مشین گنیں چلنے کی آوازیں آنے لگیں، جو کبھی تیز ہو جاتیں اور کبھی مدھم۔ اسی کے ساتھ زوردار دھماکوں کی آوازیں بھی بلند ہونے لگیں جیسے میدانِ جنگ میں توپیں داغی جا رہی ہوں۔ لوگوں نے عمارتوں کی چھتوں پر چڑھ کر دیکھا کہ ہر طرف اونچے اونچے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور آتشیں گولے ایک جگہ سے دوسری جگہ برس رہے ہیں جیسے بہت ساری آتشبازیاں ایک ساتھ چھوڑی جا رہی ہوں۔

رات بھر اللہ اکبر اور جیئے بنگلہ کے نعرے بلند ہوتے رہے۔ صبح ہوتے ہی معلوم ہوا کہ فوج حرکت میں آچکی ہے۔ سارے شہر میں کرفیو نافذ ہو چکا ہے اور فوج نے عوامی لیگ کی تحریک سول نافرمانی اور ایسٹ پاکستان رائفلز اور ایسٹ پاکستان ریجمینٹ کی بغاوتیں کچل دی ہیں۔ اس اعلان کے ساتھ ہی بہاریوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ انھوں نے بنگالیوں کے گھروں پر حملے شروع کر دیے اور لوٹ مار اور آتشزنی کے بعد انھیں موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔ ۴۸ گھنٹے کا کرفیو ختم ہوتے ہی وہ سب سے پہلے عزیز چودھری کی خیریت معلوم کرتے لال باغ پہنچا۔ فوجی کارروائی کی وجہ سے عزیز چودھری، رقیہ اور اس کی امّی بہت پریشان اور سہمی ہوئی تھیں۔ گزشتہ دو دنوں سے مارے ڈر کے ان کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ وہ لوگ مسلسل جاگ رہے تھے۔ اِس دوران ان سے نہ ایک لقمہ کھایا گیا اور نہ لمحہ بھر کے لیے پلکیں جھپکیں۔ صمد کو دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی اور عزیز چودھری اس سے بے اختیار لپٹ گئے۔

عزیز چودھری نے اسے بتایا کہ ان کے محلّے میں رات بھر گولیاں چلتی رہیں اور بے شمار لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ زخمی ہونے والے مختلف ہسپتالوں میں داخل کیے گئے، لیکن مرنے والوں کی لاشیں غائب کر دی گئیں۔ عزیز چودھری نے اسے مزید بتایا کہ شہر کے تمام بنگالی بھاگ کر دریا کے اُس پار زنجیرا، ساورا اور ٹنگائیل وغیرہ میں پناہ لے رہے ہیں۔ اہلِ محلہ نے انھیں بھی شہر سے بھاگ جانے کا مشورہ دیا تھا، لیکن انھوں نے ان کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ شمس الحق کی طرح وہ بھی مہاجر ہیں اور مغربی بنگال سے ترکِ وطن کر کے آئے ہیں، وہ بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ انھوں نے شہر میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا ہے، خواہ یہاں کچھ بھی کیوں نہ پیش آئے۔ انھیں صرف رقیّہ کی فکر ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ پنجابی فوجی نوجوان لڑکیوں کو اُٹھا کر لے جاتے ہیں، لیکن انھیں اس پر یقین نہیں ہے۔

اس نے عزیز چودھری اور گھر کے دوسرے لوگوں کو دلاسا دیتے ہوئے کہا "آپ لوگ بالکل نہ گھبرائیں، میں فی الحال آپ لوگوں کے ساتھ ہوں اور اس وقت تک رہوں گا جب تک حالات معمول پر نہیں آجاتے۔ میرے رہتے ہوئے آپ لوگوں کو پریشانی نہیں ہوگی"۔ صمد نے شمس الحق کو جب تمام باتیں بتائیں تو انھوں نے اسے وہاں رہنے کی فوراً اجازت دے دی اور دوسرے روز وہ ان کے ہاں منتقل ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ سارا شہر چند دنوں کے اندر خالی ہو چکا ہے اور بنگالیوں کی اکثریت خوف کے مارے دیہات کی جانب بھاگ چکی ہے۔ پھر حالات رفتہ رفتہ معمول پر آنے لگے۔ مسلّح باغیوں نے دیہات میں مورچہ سنبھال لیا اور پاکستانی فوج شہر ڈھاکہ میں بغاوت کو کچلنے کے بعد دیہی علاقوں کی جانب پیش قدمی کرنے لگی۔ حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ پورے مشرقی پاکستان پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے دو ماہ اور باغیوں کے مکمّل صفایا کے لیے چھ ماہ کا عرصہ لگا۔ اس اثنا میں بے شمار نہتے اور مظلوم افراد مارے گئے۔ میمن سنگھ، سانتاہار، کُشٹیا، دیناج پور اور سان تمام علاقوں میں جہاں بہاری تھوڑی تعداد میں تھے، نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دیے گئے۔ پابتی پور، سید پور، کھلنا اور چاٹگام

جیسے شہروں میں اُنھیں اِس لیے زیادہ نقصان نہیں پہنچا کہ وہاں فوجی چھاؤنیاں تھیں، پاکستانی فوج نے انھیں قتلِ عام سے بچا لیا تھا۔ اس اثنا میں اس قدر قتل و غارت گری ہوئی کہ عمدکا انسان پر سے اعتماد اُٹھ گیا۔ اس نے اپنی آنکھ سے البدر اور الشمس کے رضاکاروں کو معصوم اور بے گناہ لوگوں پر مظالم ڈھاتے اور انھیں قتل کرتے ہوئے دیکھا، لیکن وہ اپنی زبان سے اُف تک نہ کر سکا کیوں کہ اس کے خود مصیبت میں گھر جانے کا اندیشہ تھا۔

پھر ایک دن صورتِ حال بدل گئی۔

ستمبر کی ابتدا میں بھارت سے سرحدوں پر تصادم شروع ہو گیا۔ ڈھاکہ شہر اور دیہی علاقوں میں باغیانہ اور چھاپہ مار سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ ۳ر دسمبر کو بھارت اور پاکستان کے درمیان باقاعدہ جنگ چھڑ گئی اور بھارتی فوج نے پیش قدمی شروع کر دی۔ ڈھاکہ پر دن رات بمباری ہونے لگی۔ ساتھ ہی چھاپہ ماروں کی جانب سے سرکاری تنصیبات میں توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری رہا۔ جنگ شروع ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس طرح راتوں رات صورتِ حال بدل گئی۔

بی بی سی اور آل انڈیا ریڈیو کئی دنوں سے ہتھیار ڈال دینے کی خبریں نشر کر رہے تھے، لیکن بہاری عوام اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ پاکستانیوں کے حوصلے پست کرنے کے لیے دشمن کا پروپیگنڈہ ہے۔ وہ ریڈیو پاکستان بڑی باقاعدگی سے سنتے اور اس کی ایک ایک بات پر یقین کرتے۔ جب پاکستانی فوج سے قریبی تعلق رکھنے والے حلقوں میں ہتھیار ڈالنے کے بارے میں سرگوشیاں شروع ہوئیں تو بھی انھیں یقین نہیں آیا۔ ۱۶ر دسمبر کو بھارتی طیاروں کی بمباری اچانک بند ہو گئی۔ بھارتی طیارے انتہائی نیچی پروازیں کرتے۔ لیکن نہ بم برساتے اور نہ مشین گنوں سے فائر کرتے۔ پھر ایک دن میرپور اور محمد پور کے لوگوں نے علی الصبح گرانڈ ٹرنک روڈ پر بھارتی فوج کی جیپ کاروں، ٹرکوں اور فوجیوں کو مارچ کرتے ہوئے دیکھا اور اسی کے ساتھ بہاریوں میں کہرام مچ گیا۔ بوڑھے سے لے کر بچے اور عورتیں تک سقوطِ ڈھاکہ

پر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور انھیں مکتی باہنی کے ہاتھوں اپنی موت یقینی نظر آنے لگی۔ بچے ماؤں سے دودھ اور شوہر بیوی سے دین مہریں بخشوانے لگے اور باری تعالیٰ کے سامنے سر بہ سجود ہو کر اپنی اپنی زندگی کے لیے دعائیں مانگنے لگے۔

شہر کی سنگین صورتِ حال کے پیشِ نظر صمد نے عزیز چودھری کے مشورے سے شمس الحق اور اپنی امّی کو ان کے ہاں منتقل کرنا چاہا، لیکن وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ لال باغ کی بہ نسبت محمد پور بہاریوں کے لیے زیادہ محفوظ ہے اور یہاں سے نکل کر دوسری جگہ جانا دانش مندی نہیں۔ موت کے خوف نے شمس الحق جیسے روشن خیال شخص کو بھی بنگالی اور غیر بنگالی کے انداز میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انھیں اس پر اعتراض نہیں تھا کہ صمد، عزیز چودھری کے ہاں کیوں رہتا ہے۔ وہ صمد کے وہاں رہنے پر خوش اور مطمئن تھے، کیوں کہ وہ وہاں زیادہ محفوظ تھا۔ محلہ کے لوگوں کو شمس الحق اور صمد کے سیاسی نظریے اور جماعتی وابستگی کا علم تھا، اس لیے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کون کب صمد کے بارے میں ملٹری انٹلی جینس کو مطلع کر کے گرفتار کروا دے۔ اس لیے صمد کا ان کے گھر میں نہ رہنا ہی اس کے حق میں بہتر تھا، لیکن صمد کا خیال تھا کہ اب بہاریوں کا محلہ محفوظ نہیں ہے، لیکن اس سے قبل کہ اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا جاتا، ڈھاکہ پر بھارتی فوج کا قبضہ ہو چکا تھا۔

سقوطِ ڈھاکہ کے دوسرے روز عزیز چودھری نے اُسے شمس الحق اور اس کی امّی کو زبردستی اپنے ہاں لانے کے لیے بھیج دیا۔ پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد محمد پور اور میر پور میں بھارتی فوج تعینات کر دی گئی اور میر پور اور محمد پور پورے شہر سے کٹ کر رہ گیا۔ کسی میں نہ محمد پور جانے کی ہمّت تھی اور نہ وہاں سے باہر نکلنے کی جرأت۔ بہاریوں نے خود کو گھونگے کی طرح اپنے خول میں سمیٹ لیا، لیکن صمد جرأت کر کے گھر سے باہر نکل آیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح لال مٹیا کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک جیپ نہایت تیزی سے اس کے قریب آ کر رُکی اور مکتی باہنی کے سپاہیوں نے اسے چاروں طرف سے دبوچ لیا۔

صمد نے انھیں بنگلہ میں بتایا کہ وہ طالب علم رہنما ہے اور اپنے ایک دوست کی خیریت معلوم کرنے کے لیے محمد پور جا رہا ہے۔ مکتی باہنی کے سپاہیوں کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ اور وہ اسے پکڑ کر سینٹ جوزف اسکول لے گئے، جو اس وقت مکتی باہنی کا کیمپ بنا ہوا تھا۔ اسے کیمپ کمانڈر خالد چودھری کے سامنے پیش کیا گیا، جسے اس نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔ خالد چودھری نے بھی اسے پہچاننے میں دیر نہیں کی۔ وہ دونوں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ وہ معاشیات کا طالب علم تھا اور خالد سیاسیات کا۔ اُس کا ایپسو سے تعلق تھا اور اس کا چھاترو لیگ سے۔ یونیورسٹی کے دنوں میں دونوں میں خوب سیاسی بحثیں رہتیں، دونوں نہایت سختی کے ساتھ اپنے اپنے مؤقف پر قائم رہتے اور کوئی کسی کو قائل نہ کر پاتا۔ خالد چودھری کو معلوم تھا کہ بہاری ہونے کے باوجود وہ ان کی جدوجہد میں شریک ہے، تاہم اس نے اس سے ایک دن کہا تھا "اگر کبھی خانہ جنگی ہوئی تو سب سے پہلے تمہاری طرح لبرل لوگ نشانہ بنیں گے، انقلاب میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ اصول کی خاطر دوستوں اور عزیزوں کو بھی قتل کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اگر وہ اسے قتل کر دے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔"

اُس نے جب خالد چودھری کو مکتی باہنی کے کمانڈر کے روپ میں دیکھا تو اسے ساری باتیں یاد آ گئیں اور وہ دل ہی دل میں اس سے خوف محسوس کرنے لگا۔ خالد نے پہلے اسے بڑی حیرت سے دیکھا، جیسے اُسے اُس کے ابھی تک زندہ رہنے پر تعجب ہو۔ پھر اُس نے بڑے تپاک سے اس سے ہاتھ ملایا اور اپنی میز کے قریب خالی کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

"تم یہاں کیسے؟"

"اپنے والدین کو لینے آیا ہوں۔"

"تمہارے والدین کہاں ہیں؟"

"نمبر ۱۷، قائداعظم روڈ میں۔"

صمد نے اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے والدین کو محمد پور سے نکالنے میں مدد کرے،

کیوں کہ محمد پور میں اب زیادہ دنوں تک رہنا خطرے سے خالی نہیں۔

خالد چودھری نے اس کی درخواست سُن کر زوردار قہقہہ لگایا اور اس کے سینے میں اپنی چھڑی چبھوتے ہوئے کہا "صمد میاں، اب تم لوگوں کا دَور ختم ہو چکا ہے۔ اب ہمارا دَور ہے۔ اب ہمارے انتقام لینے کی باری ہے۔ ہم تم بہاریوں سے چُن چُن کر بدلہ لیں گے اور جب تک تمام بہاریوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دیں گے۔ ہمارے انتقام کی آگ نہیں بجھے گی"

صمد نے کہا "میں نے بنگالیوں کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا، میں نے ان کے کاز کی حمایت کی ہے۔ میں تم لوگوں کے ساتھ ہوں، تم مجھے اپنا دشمن کیوں سمجھتے ہو؟"

"تم جھوٹ کہتے ہو، تم ہرگز ہم لوگوں میں سے نہیں ہو سکتے"۔ خالد نے تقریباً چیخ کر کہا۔ "بہاری صرف بہاری ہوتا ہے۔ وہ ہرگز بنگالی نہیں ہو سکتا۔ تم بھی خالص بہاری ہو۔ مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کرو"۔

"خالد، تم انتقام کی آگ میں پاگل ہو چکے ہو، تم نے انسانیت کا دامن چھوڑ دیا ہے؟"

"یہ سب بکواس ہے، تم لوگوں نے میرے بوڑھے ماں باپ کو قتل کیا ہے، میری جوان بہن کی عصمت لوٹی ہے۔ میرے معصوم بھائی کو جلتی ہوئی جھونپڑی میں پھینک دیا ہے۔ اس پر تم پوچھتے ہو میرے دل میں انتقام کی آگ کیوں بھڑک رہی ہے؟"

"یہی تم لوگوں نے بہاریوں کے ساتھ کیا ہے اور یہی آج تم ان کے ساتھ کرنے والے ہو۔ تم میں اور ان میں کیا فرق ہے؟"

صمد کو خالد کی باتیں سن کر اشتعال آ گیا اور اس نے انجام کی پروا کیے بغیر اسے سخت سُست سنا ڈالا۔

"اس شخص کو بند کر دو لاک اپ میں"۔ اُس نے چیخ کر سنتری کو حکم دیا۔ "اگر تم سے پرانی شناسائی نہ ہوتی تو میں تمھیں گولی مار دیتا"۔

غصّے کے مارے خالد کے منھ سے کف نکل رہی تھی اور وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح کمرے

میں ٹہل رہا تھا۔

سنتریوں نے اس کے دونوں بازوؤں کو دبوچ لیا اور اُسے ایک بڑے کمرے میں بند کر دیا۔ دوسرے دن اسے ڈھاکہ سنٹرل جیل پہنچا دیا گیا، جہاں وہ تقریباً پندرہ روز قید رہا۔ اس عرصے میں اسے اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اس نے جیل سے عزیز چودھری کو خط لکھ کر تمام حالات سے باخبر کیا۔ عزیز چودھری کی مسلسل کوششوں اور تگ و دو کے بعد اسے سولہویں روز بڑی مشکلوں سے رہا کیا گیا۔ وہ جیل سے رہا ہوتے ہی سیدھے محمد پور پہنچا۔

محمد پور میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سڑکیں اور گلیاں ویران تھیں اور تمام بہاری خوف و دہشت سے اپنے اپنے گھروں میں چھپے ہوئے تھے۔ نہ بڑوں کی باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی اور نہ بچوں کے رونے اور چیخنے کی آواز۔ جیسے پوری آبادی کو موت نے نگل لیا ہو۔ بھارتی فوج کی جیپ کبھی کبھی سڑک پر تیزی سے گزر جاتی اور اس طرح خاموشی کے اتھاہ سمندر میں چند لمحوں کے لیے ارتعاش پیدا ہو جاتا۔

صمد جب اپنے گھر پہنچا تو اُسے مقفل پایا۔ پڑوس کے مکانات کے دروازے بھی اندر سے بند تھے۔ باہر سے یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ اندر کوئی ہے یا نہیں۔ اس نے صبور چچا کے مکان کے دروازے پر زور سے دستک دی اور نہایت بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اندر سے کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے اور بھی زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور دو تین بار دروازے پر لاتیں ماریں۔ دروازہ کھلوانے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ اس نے کھٹ سے دوسری منزل کا دریچہ کھولنے کی آواز سُنی۔ صبور چچا کی بیوی نے دریچے سے جھانک کر دیکھا اور اُسے دیکھتے ہی "صمد" کہہ کر چیخ پڑیں۔ ایک لمحے کے اندر خاموش اور ویران گھرانے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ کسی نے تیزی سے زینے سے اُتر کر دروازہ کھولا اور اُسے اندر کھینچ لیا۔ چچی اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسری منزل پر لے گئیں، جہاں اس کی امّی بہت بیمار تھیں اور اُن پر بار بار غشی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ گزشتہ پندرہ دنوں سے وہ بے سدھ پڑی ہوئی تھیں۔ انھیں جب بھی

ہوش آتا، وہ "صمد" اور "صمد کے بابا" کہ کر چیخ اُٹھتیں، اِدھر اُدھر وحشت ناک نظروں سے دیکھتیں اور پھر چیخ مار کر بیہوش ہو جاتیں۔

چچی نے صمد کو بتایا، یہ سلسلہ اُس وقت سے جاری ہے، جب سے مُکتی باہنی کے سپاہی محلّے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ شمس الحق اور تمہارے صبور چچا کو پکڑ کر لے گئے ہیں اور دریا کے کنارے سات گنبد مسجد کے قریب اُنھیں گولی مار دی ہے۔ چچی نے اسے مزید بتایا کہ سقوط کے بعد مُکتی باہنی کا ایک دستہ ایک نوجوان افسر کی سرکردگی میں ان کے گھر آیا اور شمس الحق اور صبور چچا کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اُس کے بعد وہ پھر واپس نہیں آئے۔ اس کی امّی اس کے ابّو کی ہلاکت کا صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور اس کے بعد وہ پھر سنبھل نہ سکیں۔

صمد تمام باتیں سُن کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اُس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو سکا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ مُکتی باہنی کا نوجوان افسر کون تھا اور وہ اس کے ابّو کا پتا کیوں پوچھ رہا تھا۔ اس کی امّی جب دوبارہ ہوش میں آئیں اور صمد کو دیکھا تو اس سے چیخ کر لپٹ گئیں اور بچّوں کی طرح بِلک بِلک کر روتی رہیں۔ صمد سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ اس کے صبر کا بند ٹوٹ گیا اور وہ اس وقت تک روتا رہا، جب تک کہ اس کا دل ہلکا نہ ہو گیا۔ ماں اور بیٹے کو روتا ہوا دیکھ کر دوسرے لوگ بھی بے اختیار رو پڑے اور سارا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

اس حادثے کے بعد صمد کئی دنوں تک بالکل خاموش اور اداس رہا۔ اس سے نہ سویا گیا، اور نہ کچھ کھایا ہی گیا۔ وہ خاموش بیٹھا رات بھر ان واقعات کے بارے میں سوچتا رہا، جن سے وہ دوچار ہوا اور جن کے نتیجے میں اس کے انتہائی روشن خیال اور بنگالیوں کے ہمدرد باپ کو قتل کر دیا گیا۔

اسے معلوم تھا کہ شمس الحق کو کس نے قتل کیا ہے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُنھیں کیوں قتل کیا گیا؟ ان کی ساری زندگی بنگالیوں کے ساتھ گزری تھی، جنھوں نے کبھی بنگالیوں کے خلاف کام نہیں کیا، وہ ہمیشہ بنگالیوں کے ہمدرد رہے، ان کی روشن خیالی اور بنگالی

دوستی کے طفیل اس نے بچپن سے بنگالیوں کا احترام کرنا سیکھا، حتیٰ کہ مشرقی پاکستان کو اپنا وطن تصوّر کیا، اس کے باوجود شمس الحق کو قتل کر دیا گیا۔

اس نے سوچا۔

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ نسلاً بنگالی نہیں تھے۔ بنگالی قوم پرستی نے بالآخر نسل پرستی کی شکل اختیار کر لی تھی اور انتہا پسند بنگالی ڈھاکہ کے قدیم باشندے کُٹّیوں اور ڈھاکے کی نواب فیملی کو بھی بنگالی ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ اگر گرفتار نہ کیا جاتا تو وہ بھی یقیناً شمس الحق کے ساتھ قتل کر دیا جاتا۔ اس کی بنگالی دوستی اور انصاف پسندی پر کسی کو یقین نہیں آیا۔ اسے خالد چودھری کی بات یاد آئی، جس نے کہا تھا "اگر کبھی خانہ جنگی ہوئی تو تمہاری طرح لبرل لوگ سب سے پہلے نشانہ بنیں گے، خانہ جنگی میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا، اصول کی خاطر دوستوں تک کو قتل کرنا پڑتا ہے۔"

اُسے اس طرح سوچتے ہوئے تین دن گزر گئے۔

آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے یہ سرزمین چھوڑ دینی چاہیے۔ نفرت اور عداوت کی خلیج اس قدر بڑھ چکی ہے کہ اب اسے پاٹنا ممکن نہیں ہے۔ یہ خلیج لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی ہے۔ اُس جیسے.... لوگ بالآخر اس میں غرق ہو جائیں گے۔

اس کا خیال درست ثابت ہوا۔

سقوط کے چند دنوں کے اندر محمد پور اور میر پور کا انتظام بھارتی فوج کی جگہ مکتی باہنی نے سنبھال لیا اور اِسی کے ساتھ لوٹ مار، قتل و غارت اور عصمت دری کے واقعات رُونما ہونے لگے۔ بھارتی فوج جب تک میر پور اور محمد پور میں تعینات رہی بہاریوں کی زندگی محفوظ رہی، لیکن اس کے ہٹتے ہی لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ مکتی باہنی کے دستے گھروں میں گھستے، اسٹین گن اور رائفلز تان کر تمام لوگوں کو قطار میں کھڑے کرتے اور پھر نقدی زیورات اور جو جی چاہتا لے کر چلے جاتے۔ کوئی چوں چرا تک نہ کر پاتا۔

چند دنوں کے بعد محمد پور کے تمام بہاریوں کو ان کے گھروں سے نکال کر کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا اور تمام پختہ مکانوں اور بنگلوں پر بنگالیوں کا قبضہ ہو گیا۔ وہ بھی اپنی ضعیف اور کمزور ماں کو لے کر کیمپ میں منتقل ہو گیا۔ عزیز چودھری کو جب معلوم ہوا کہ محمد پور میں تمام بہاری اپنے گھروں سے نکال دیے گئے ہیں تو وہ گھبرائے ہوئے محمد پور پہنچے۔ انھوں نے بڑی مشکل سے صمد کو تلاش کیا۔ وہ جب سے قید سے رہا ہو کر آیا تھا، ایک بار بھی اُن سے ملنے نہیں گیا تھا، جس کی وجہ سے انھیں اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ عزیز چودھری کو جب شمس الحق کے ہلاک ہونے کا علم ہوا تو وہ بہت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلے۔ اُنھوں نے اُسے اور اس کی امّی کو اپنے ساتھ لال باغ لے جانا چاہا لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوا۔ اب اس کی تقدیر بہاریوں کی تقدیر سے الگ نہیں تھی۔

اس نے نہایت ادب اور عاجزی سے کہا "آپ تو ہمیں پناہ دینے کے لیے تیار ہیں، لیکن عوام ہمیں معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ صرف شمس الحق کے خاندان کا سوال نہیں ہے، لاکھوں بہاری خاندانوں کا سوال ہے۔ آپ کن کن لوگوں کو پناہ دیں گے؟"

عزیز چودھری نے اسے سمجھانا چاہا "بیٹے، یہاں تم اور تمہاری امّی کی زندگی خطرے میں ہے۔ تم لوگ چند دنوں کے لیے ہمارے ہاں چلو، حالات سدھر جائیں گے تو واپس آجانا۔"

"چاچا، زندگی بھر بنگالیوں کے حق کے لیے لڑنے کے باوجود بنگالی عوام کی نظروں میں ہم بہاری کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ بہاریوں سے الگ ہماری کوئی شناخت نہیں، ہم بدنصیبوں کو ہمارے حال پر چھوڑ دیجیے۔"

عزیز چودھری اُسے اور اُس کی امّی کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے، اپنے ساتھ چلنے کے لیے اُن کی منّتیں کرتے رہے، لیکن صمد تیار نہیں ہوا۔ وہ ذہنی طور پر اتنا متاثر تھا کہ اس کا انسانی رشتے، دوستی، محبّت اور بھائی چارے پر سے اعتماد اُٹھ چکا تھا۔ عزیز چودھری کو مایوس ہو کر

لوٹنا پڑا۔

اُس نے رہائی کے بعد رقیہؔ سے ایک دفعہ بھی ملاقات نہیں کی۔ رقیہؔ اس سے ملنے کے لیے بے چین رہی۔ اس کے اصرار پر ہی عزیز چودھری ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے آئے تھے۔ اسے جب شمس الحق کے ہلاک کیے جانے اور صمد کے اس کے ہاں آنے سے انکار کرنے کا علم ہوا تو اس سے رہا نہ گیا اور وہ اسے تلاش کرتے ہوئے کیمپ تک پہنچ گئی۔ وہ اپنے ساتھ کھانے پینے کی بہت سی چیزیں لائی، اُسے معلوم تھا کہ روزگار کے ذرائع بند ہو جانے کی وجہ سے لوگ فاقہ کر رہے ہیں۔ بہاریوں کے پاس جو تھوڑے بہت اثاثے لٹنے سے بچ گئے تھے، وہ انھوں نے اونے پونے فروخت کر دیے تھے، اب سوائے ریڈ کراس کی امداد کے ان کے پاس زندہ رہنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ رقیہؔ اپنے ساتھ ایک سوتی ساڑی بھی لیتی آئی تھی، جسے اس کی ماں نے صمد کی امّی کے لیے دیا تھا۔ صمد کی امّی نے اس کی لائی ہوئی تمام چیزیں خاموشی سے قبول کر لیں اور اُسے ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ قبول کیے بنا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ریڈ کراس سے پندرہ روز کے لیے جو چاول، دال، گندم اور دوسری چیزیں ملتی تھیں وہ ان کی ضرورت کی بہ نسبت بہت کم تھیں اور ان کے ہاں آئے دن فاقہ رہتا تھا۔

رقیہؔ نے جب کیمپ میں اُن کی حالت دیکھی تو اس سے رہا نہ گیا اور وہ رونے لگی۔ صمد اسے روتا ہوا دیکھ کر اس کی ہمّت بڑھانے اور اس کا مذاق اُڑانے کی کوشش کرنے لگا، تاکہ اس کا دل ملول نہ ہو۔

اس نے کہا "عجب پاگل لڑکی ہے، اس میں رونے کی کیا بات ہے، یہ تو ہمارا مقدّر تھا۔ ایک نہ ایک دن ایسا ہونا ہی تھا سو ہوا۔ اس میں رونے یا افسوس کرنے کی کیا بات ہے؟ ہم سب تاریخی جبریت کے شکار ہیں پاگل، ہمیں تو اس پر ہنسنا چاہیے، اُن حالات پر ہنسنا چاہیے، جن کے تحت یہ ملک بنا، جن کے تحت ہم نے اپنا وطن چھوڑا اور اس خطّۂ ارض کو اپنا وطن سمجھا۔ ان لمحوں پر ہنسنا چاہیے جب ابّو نے اس سرزمین سے محبّت کی، اس کی زبان

وتہذیب کو اپنایا۔ پھر بھی اس سرزمین نے اُنھیں قبول نہیں کیا"، کہتے کہتے اس کی آواز روندھ گئی۔

وہ اسے بہت دیر تک سمجھاتا اور تسلّی دیتا رہا اور رقیہؔ خاموشی سے بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔ اس سے کچھ بھی نہ کہا گیا، وہ نہ اُنھیں اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہہ سکی اور نہ صمد سے اتنے دنوں تک نہ ملنے کی ہی شکایت کر سکی۔ رقیہؔ کو اگر کسی بات کا شدید قلق تھا تو وہ شمس الحق کے قتل کا تھا۔ اُسے اِس کا بھی افسوس تھا کہ صمد جیسا رجائی شخص بھی حالات سے اس قدر مایوس ہے۔

رقیہؔ جب واپس ہونے لگی تو صمد نے کہا "میں نے امّی کے ساتھ پاکستان چلے جانے کا فیصلہ کیا ہے!"

"کیا؟" رقیہ حیرت زدہ رہ گئی۔

"ہاں رقیہ، میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب ہمارا یہاں رہنا ممکن نہیں ہے۔ مولانا اور مبین کا بھی یہی خیال ہے کہ اب ہمارا یہاں کوئی مستقبل نہیں ہے۔"

"لیکن تم نے تو ....." رقیہؔ شدّتِ جذبات سے جملہ مکمّل نہ کر سکی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

"ہاں، میں نے کہا تھا کہ مجھے اس سرزمین سے محبّت ہے۔ میں کبھی یہاں سے نہیں جاؤں گا لیکن حالات بہت بدل چکے ہیں، ہم آہنگی کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی ہیں، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ایک بار پھر اجنبی سرزمین کو وطن بنایا جائے۔"

"لیکن صمد.... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

اس نے بالآخر اظہارِ محبّت کر ہی دیا۔ وہ فرطِ جذبات سے پھر اپنا جملہ مکمّل نہ کر سکی اور آنچل سے اپنا چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

"نہ رو رُقیّہ"، اس نے بڑے پیار سے کہا "ہم سب حالات سے مجبور ہیں۔ حالات کے تیز دھارے کے سامنے ہماری حیثیت تنکوں سے زیادہ نہیں، ہم اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔"

رقیہ بہت دیر تک روتی رہی اور صمد اسے دلاسا دینے کی کوشش کرتا رہا۔

صمد کے کان میں ابھی تک اُس کی آواز گونج رہی تھی۔

"تم نہ جاؤ صمد، مجھے تمہارے جانے کا بہت افسوس ہوگا۔

اس نے رقیہ کی ایک نہ سُنی اور پاکستان جانے کے فیصلے پر اٹل رہا۔ اب اس کے وہاں رہنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ صرف اس کا ہی نہیں، کسی بھی غیر بنگالی کا وہاں رہنے کا سوال نہیں تھا تاہم بعض لوگ پاکستان جانے میں کامیاب رہے، اور بعض ناکام۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا، جنھوں نے خود کو مغربی پاکستان کا باشندہ ظاہر کیا اور کسی نہ کسی طرح کلیرنس حاصل کر لیا۔ اس نے روانگی سے قبل کٹھمنڈو، رنگون اور طہران کے ذریعے اپنے کئی دوستوں کو پاکستان خط لکھا اور وہاں کے بارے میں تفصیلات معلوم کیں۔ اس کے تمام دوستوں نے خط کے جواب میں اُس کے پاکستان آنے کی شدید مخالفت کی اور وہاں کے بارے میں حوصلہ شکن باتیں بتائیں۔ سب نے یہی لکھا کہ یہاں کے لوگوں کو بہاریوں کے مسائل اور ان کے مصائب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، جو لوگ یہاں آ گئے ہیں اُنھیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا اور انھیں یہاں کی معیشت پر بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ مقامی باشندے ان کی آمد کے سخت مخالف ہیں اور وہ لوگ بھی ان کی آمد کے خلاف ہیں جو ستائیس ۲۷ سال قبل بھارت سے آئے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ وہ بنگلہ دیش میں ہی رہنے کی کوشش کرے اور پاکستان آنے کا ارادہ ترک کر دے۔

ڈھاکہ میں رہتے ہوئے اُسے وہاں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا اور اس کی ساری خوش فہمیاں ختم ہو چکی تھیں، پھر بھی اس نے بنگلہ دیش چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

رقیہ اُسے اور اس کی امّی کو جب کیلو کیمپ میں رخصت کرنے کے لیے آئی تو اس نے اس سے صرف اتنا کہا۔

"آج، جب کہ میں تم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہا ہوں، صرف اتنا کہنا چاہتا

ہوں کہ تم مجھے بہت یاد آؤ گی"۔

لاؤڈ اسپیکر پر ایئر ہوسٹیس کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

" خواتین وحضرات، اب ہم کراچی پر پرواز کر رہے ہیں۔ ہمارا جہاز چند لمحوں میں اُترنے والا ہے۔ اپنے اپنے بیلٹ باندھ لیجیے اور سگریٹ بجھا دیجیے، شکریہ"۔

اس نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ اس کے خوابوں کی سرزمین آچکی تھی، وہ سرزمین، جہاں اسے رہنا ہے اور جو اُسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اجنبی

ٹیلی پرنٹر پر نظر پڑتے ہی وہ چونک پڑا۔

فلیش .... فلیش .... فلیش

وہ ٹیلی پرنٹر کے سامنے رک گیا۔

ضرور کوئی غیر معمولی بات ہے، ورنہ ٹیلی پرنٹر نیوز ڈسک کی توجہ اس طرح اپنی جانب مبذول نہ کرتا۔

خبر پڑھتے ہی اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور سارے دفتر میں سنسنی پھیل گئی۔

"تو بالآخر میرا اندیشہ درست ثابت ہوا"

اُس نے سوچا اور اُس کی آنکھوں کے سامنے دھان منڈی کا وہ بنگلہ گھوم گیا، جہاں وہ دوسرے صحافیوں کے ساتھ صبح سے شام تک خبروں کی تلاش میں بیٹھا رہتا تھا۔ صحافیوں کے ہجوم میں وہ تنہا غیر بنگالی تھا جو بونگو بوندھو کے ہاں بلا کسی خوف کے صبح سے شام تک بیٹھا رہتا تھا۔ لوگ اُس سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ غیر بنگالی ہوتے ہوئے بھی بنگلہ زبان سے

اچھی طرح واقف تھا اور بالکل اُن کے لب و لہجہ میں گفتگو کرتا تھا۔

وہ میز پر آ کر خاموش بیٹھ گیا۔

ہر شخص اپنے ڈیسک سے اُٹھ کر ٹیلی پرنٹر کے سامنے جمع ہو گیا اور نہایت اضطراب کے عالم میں تفصیلات معلوم کرنے لگا، اُسے اِس بارے میں مزید تفصیلات جاننے سے دلچسپی نہ تھی۔

وہ آنکھیں بند کر کے ماضی کے جھروکے میں جھانکنے لگا۔

اس بارے میں مزید جان کر کیا ہو گا۔ جو کچھ ہوا اُسے اس کی بہت پہلے توقع تھی۔ اُس کی دنیا بہت پہلے اُجڑ چکی تھی، اب اگر ایک اور دنیا اُجڑ گئی تو کیا ہوا؟

"اب تمہارا یہاں آنا جانا مناسب نہیں ہے۔ صورتِ حال تیزی سے بگڑ رہی ہے۔ لوگ تمھیں شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے تم پاکستان کے ایجنٹ ہو اور ہمارے بارے میں جھوٹی خبریں بھیجتے ہو، اِس لیے بہتر ہے کہ اب تم یہاں نہ آیا کرو۔"

ایک دن بونگو بوندھو کے بھانجے اور پریس سکریٹری بادشاہ نے اُس سے کہا۔

"میں یہاں آنا جانا بند کر دوں؟ اِس لیے کہ لوگ مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں؟ لیکن میں ایسا کیوں کروں؟ میں بھی تو تم ہی میں سے ہوں۔ میرے آبا اگرچہ باہر سے آئے ہیں، لیکن میں تو بنگالی ہوں۔ میں بھی تمہاری جدوجہد میں شامل ہوں۔ مجھ میں اور تم میں کیا فرق ہے؟

"فرق میں نہیں جانتا، یہ تم اُن لوگوں سے پوچھو جو تم پر شک کرتے ہیں۔ حالات بہت خراب ہو چکے ہیں، اگر تمہارے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو ہم اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔"

"تو صورتِ حال اِس قدر سنگین ہو چکی ہے، میری طرح انسان کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے!!"

اُسے اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ وہ کرفیو میں بھی بلا جھجک محمد پور سے گلستان پیدل نکل جاتا تھا اور کبھی پولیس اور فوج کے گشتی دستوں کے ساتھ اور کبھی تنہا سنٹرل ٹیلی گراف آفس جاتا اور اپنے اخبار کو پریس ٹیلی گراف بھیج کر واپس آجاتا۔ اُسے اِس دوران ایک لمحے کے لیے بھی خوف محسوس نہیں ہوا کہ کوئی اُسے قتل کر دے گا اور اس کے عزیز و اقارب کو اس کی لاش کا سراغ تک نہیں ملے گا۔

"فرینکسین نے بالآخر اپنے خالق کو ہلاک کر ہی دیا!"

لوگ اپنی اپنی رائے ظاہر کرنے لگے۔

"میں نے کبھی خود کو اُن سے الگ محسوس نہیں کیا۔ پھر بھی انھوں نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا، لیکن یہ فضا ہمیشہ تو ایسی نہیں تھی۔ پھر یہ سب کچھ کیسے ہوا؟"

وہ اپنے خیالات کے دھارے بہنے لگا۔

اُسے اپنی بنگالی دانی پر بڑا فخر تھا اور وہ بڑے ناز سے اس کا اعلان کرتا تھا۔ اس نے بڑے شوق سے بنگلہ زبان سیکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُسے بنگالی عوام میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ وہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہی بڑے بھائی کے ساتھ شانتا ہار میں مقیم تھا، جہاں اُس کے بھائی ریلوے میں کلرک تھے اور ریلوے مزدوروں کی جدوجہد میں شریک تھے۔ اُس میں سیاسی شعور اسی دوران پیدا ہوا اور بڑے بھائی کے زیرِ اثر اس کی سیاسی تربیت ہوتی رہی۔ اُس کے بھائی کامریڈ محمد اسمٰعیل اور کامریڈ جیوتی باسو کے قریب ترین رفقا میں سے تھے۔ جب پاکستان قائم ہوا اور ہندو بنگالی ترکِ وطن کرنے لگے تو ریلوے ملازمین کی ٹریڈ یونین بھی ٹوٹ پھوٹ گئی، لیکن اس کی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ اپنے کالج کے

بنگالی ساتھیوں کے ساتھ طلبا کی تحریک میں حصّہ لیتا رہا اور اِسی دوران وہ پارٹی کا کُل وقتی کارکن بن گیا۔

اِسی دوران اُس نے تیبھاگا تحریک کے بارے میں سُنا۔ جنوبی بنگال میں کسانوں نے جوت داروں کے خلاف تحریک شروع کر رکھی تھی اور حکومت نے بٹائی پر کام کرنے والے کسانوں کی تحریک کو سختی کے ساتھ کچلنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ پارٹی کی ہدایت پر اسے "ٹیک" کا کام انجام دینے کے لیے رنگ پور بھیج دیا گیا۔ اس کام کے لیے اسے اس لیے منتخب کیا گیا کہ وہ غیر بنگالی تھا اور بڑی آسانی کے ساتھ پولیس اور انٹیلی جنس کی آنکھوں میں دُھول جھونک سکتا تھا۔ اس طرح وہ کافی عرصے تک خفیہ طور پر تیبھاگا تحریک کے لیے کام کرتا رہا۔

اِس دوران اسے بنگال کے دور اُفتادہ دیہات میں جانے، کسانوں کے درمیان رہنے اور ان کی زندگی کے مسائل اور اُن کے دکھ درد کو محسوس کرنے کا موقع ملا۔ اس موقع پر اس کی بنگلہ زبان سے واقفیت بہت کام آئی اور اس کی وجہ سے وہ کسانوں میں اچھی طرح گھُل مِل گیا۔ اُس نے وہاں رہ کر نہ صرف جنوبی بنگال کی مقامی بولی سیکھی، بلکہ اُن کے لوک گیت، خاص طور پر بھَوّیا میں بھی بڑی مہارت حاصل کر لی اور ایک سال کے طویل قیام نے اُسے ہر اعتبار سے دیہاتی بنا دیا۔

اُس نے اپنے کو جوت داروں کے گماشتوں اور پولیس کے مُخبروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے گاؤں کے ایک پرائمری اسکول میں ملازمت کر لی، جسے کسان سمیتی کے ایک کارکن نے قائم کیا تھا اور جس کا ہیڈ ماسٹر خود کسی زمانے میں پارٹی کا سرگرم کارکن تھا اور اب ضعیفی کے باعث عملی سیاست سے علیٰحدہ ہو چکا تھا، لیکن اُس کی ہمدردیاں اب بھی پارٹی کے ساتھ تھیں۔ وہ اس طرح کافی عرصے تک وہاں کام کرتا رہا۔ اِس اثنا میں اُس کی ملاقات رحمت میاں سے ہوئی، جو کسان سمیتی کا بہت اہم رہنما تھا اور جس کی قیادت میں پورے ضلع میں تحریک چل رہی تھی۔

رحمت میاں نے ایک دفعہ اُسے عید کے روز اپنے ہاں کھانے پر بلایا اور اس طرح اس کا

رحمت میاں کے ہاں آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اُس نے آمنہ کو پہلی بار رحمت میاں کے ہاں ہی دیکھا۔

آمنہ نے اُسے پہلی نظر میں ہی بہت متاثر کیا۔ اُس وقت اُس کی عمر بمشکل انیس ۱۹ یا بیس ۲۰ سال ہو گی۔ اُس نے جب اُسے رحمت میاں کے ہاں پہلی بار دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس دُور افتادہ گاؤں میں اتنی حسین اور پُرکشش لڑکی بھی ہو سکتی ہے۔ اُس نے اُسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ سر جھکائے اس کے سامنے کھانا چن رہی تھی۔ اُس کا سر ساری کے پلّو سے ڈھکا ہوا تھا۔ پھر بھی وہ اچھی لگ رہی تھی۔

رحمت میاں نے اُسے بتایا کہ اُس کی ماں دس سال قبل ہیضے میں چل بسی ہے۔ اس کے بعد اس نے اسے ماں کی طرح پالا اور اُسے کبھی ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ گاؤں کے بزرگوں نے اُسے بارہا دوسری شادی کرنے کا مشورہ دیا، حتیٰ کہ اس کا رشتہ تک طے کر دیا، لیکن وہ اس کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ اُسے اندیشہ تھا کہ سوتیلی ماں شاید آمنہ کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے اور وہ اس طرح ماں کی کمی محسوس کرنے لگے۔ آمنہ کی ماں کو انتقال کیے صرف دس سال ہوئے تھے۔ اس دوران رحمت میاں کے سارے بال سفید ہو چکے تھے اور آمنہ بیس ۲۰ سال کی حسین دوشیزہ بن چکی تھی۔ بنگال میں اتنی عمر تک جوان بیٹی کو گھر پر بٹھائے رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے رحمت میاں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ آمنہ کی شادی تھا۔

اُس روز اس نے رحمت میاں کے ہاں جی بھر کر کھایا۔ وہ ایک عرصے سے بھات، نمک، پیاز، اور ہری مرچ کے ساتھ کھاتا رہا تھا۔ اسے دیہات میں یہی میسّر تھا۔ اُسے شاذ و نادر ہی کبھی مچھلی، دال، چنگڑی یا انڈا میسّر ہوتا۔ اُس روز رحمت میاں نے اُس کے لیے خاص طور پر ایلش ماچھ اور پائش (فرنی) کا اہتمام کیا تھا، جسے آمنہ نے بہت عمدہ پکایا تھا۔ اُس نے بہت دنوں کے بعد سیر ہو کر کھایا اور وہ جب تک وہاں رہا اُسے کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔

آمنہ کا رنگ اگرچہ سانولا تھا، لیکن اُس کے چہرے کے نقوش بڑے تیکھے اور پُرکشش

تھے، خصوصاً اس کی آنکھیں بڑی نشیلی تھیں۔ جوانی اس کے جسم سے پھوٹی پڑ رہی تھی اور ساری کے آنچل سے اپنے جسم کو چھپانے کے باوجود اس کے سینے کی جھلکیاں نظر آ ہی جاتی تھیں۔ بنگال کے دیہات میں عورتیں یوں بھی بلاؤز سے بے نیاز ہوتی تھیں اور غریب آمنہ کو تو ساری کا ایک جوڑا بھی مشکل سے میسّر تھا۔

اُس کے بعد وہ کئی بار رحمت میاں کے ہاں گیا۔

رحمت میاں کبھی ہوتا اور کبھی نہیں۔ رحمت میاں ہوتا تو وہ اُس سے کسان سمیتی کی سرگرمیوں اور نئے علاقوں میں تحریک کی کامیابیوں کے بارے میں باتیں کرتا اور اگر وہ نہ ہوتا تو وہ صحن میں بیٹھا آمنہ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا۔ آمنہ اُسے دیکھتے ہی لمبی گھونگھٹ کھینچ لیتی اور نظریں جھکا کر اس کے سامنے پیڑھی رکھ دیتی، جس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اطمینان سے بیٹھ جائے۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی چاول چُنتی یا کھانا پکاتی رہتی اور وہ جب تک اس کے سامنے رہتا، وہ جُھکی جُھکی نظروں سے دیکھتی اور مسکراتی رہتی۔

رحمت میاں کے ہاں باقاعدگی سے آتے جاتے رہنے کی وجہ سے اب آمنہ میں پہلے کی طرح حجاب نہیں رہا تھا اور وہ اس سے تھوڑی بہت باتیں کرنے لگی تھی۔ اُس کی زیادہ تر باتیں اس کے بارے میں ہوتیں، مثلاً "اس کا پورا نام کیا ہے؟ وہ کہاں کا رہنے والا ہے؟ اس کے گھر میں کون کون ہے؟ اس کے کتنے بھائی اور بہنیں ہیں؟ اس کے ماں باپ ہیں یا نہیں، وغیرہ۔

اُس کے دل کا چور پکڑے جانے کا اندیشہ رہتا اور وہ خود ہی اُسے ساری معلومات فراہم کرتا رہتا۔ وہ اُسے بتاتا کہ وہ اپنے ماں باپ کا بہت ہی چہیتا تھا۔ اس کا ایک بڑا بھائی تھا، جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ اب وہ اپنے چچا کے ساتھ رہتا ہے، جو ڈھاکہ میں رہتے ہیں اور اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ غریب کسانوں کی مدد کے لیے شہر سے آیا ہے۔ وہ آمنہ پر خاص طور پر ظاہر کرتا کہ اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی ہے۔ اس طرح آمنہ وہ بات جان

لیتی، جسے وہ جاننے کے لیے بے چین تھی، لیکن شرم کے مارے پوچھ نہیں پا رہی تھی۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ جب بھی اس کے سامنے آتا ہے، آمنہ کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر شگفتگی آجاتی ہے اور وہ جب تک اس کے سامنے رہتا ہے، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے، لیکن اس کے جانے کی تیاری کرتے ہی اس کا چہرہ بجھ جاتا ہے۔ ایک دفعہ یہ جاننے کے لیے کہ آمنہ کے دل میں اس کی کتنی چاہت ہے، وہ اس کے ہاں کئی دنوں تک نہیں گیا اور رحمت میاں سے باہر ہی ملتا رہا۔ اسے ایک روز رحمت میاں نے بتایا کہ آمنہ کو تیز بخار ہے اور وہ اس کے بارے میں کئی بار پوچھ چکی ہے۔ اس کی علالت کی خبر سُن کر اُس سے نہ رہا گیا اور وہ سیدھے گاؤں کے واحد ایلوپیتھی ڈاکٹر سامنت مکرجی کے پاس پہنچ گیا اور بخار کی دوا لے کر سیدھے رحمت میاں کے گھر پہنچا۔ اُسے دیکھتے ہی آمنہ کے چہرے پر رونق آگئی وہی جانی پہچانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی اور ایسا محسوس ہوا، جیسے وہ کبھی بیمار رکھی ہی نہیں۔ اُس نے اسے اپنے سامنے دوا پلائی اور وہ اس کے ہاں باقاعدگی سے جانے لگا اور رفتہ رفتہ اس کی حیثیت گھر کے ایک فرد کی سی ہو گئی۔

کھیت مزدوروں میں تیبھاگا اندولن کے مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے زمینداروں اور جوت داروں میں بے چینی بڑھ گئی اور انھوں نے بٹائی پر کام کرنے والے بے زمین کسانوں کو فصل کا دو تہائی حصّہ دینے سے انکار کر دیا۔ جن کسانوں نے فصل کا نصف حصّہ لینے سے انکار کیا انھیں جوت داروں کے گماشتوں نے خوب زدوکوب کیا، جس سے بے زمین کسانوں میں زبردست اشتعال پیدا ہو گیا اور کسان سمیتی نے جوت داروں کے مسلّح کارندوں کی مزاحمت کرنے کا فیصلہ کر لیا، جس کا نتیجہ جوت داروں کے گماشتوں اور بے زمین کسانوں میں مسلّح تصادم کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس تصادم میں کئی کسان اور گماشتے ہلاک اور مجروح ہوئے۔ اس خونین واقعہ نے سارے صوبے میں سنسنی پھیلا دی۔ تصادم کی اطلاع ڈھاکہ کے تمام اخبارات میں شائع ہوئی اور ضلع میں امن و امان کی بحالی کے لیے مسلّح

پولس کا دستہ جلئے واردات پر روانہ کر دیا گیا۔ جوت داروں کی نشان دہی پر کسان سمیتی کے کئی رہنما اور کارکن گرفتار کر لیے گئے، جن میں رحمت میاں بھی شامل تھا۔ ان پر دیہات کے معصوم لوگوں کو قتل کرنے، فصل لوٹنے اور نجی ملکیت کو آگ لگانے کے الزامات میں مقدمہ درج کر لیا گیا۔ پولس اور انٹلی جینس برانچ نے کسانوں اور کسان سمیتی کے کارکنوں سے زد و کوب کر کے نہ صرف اقبالِ جرم کروا لیا، بلکہ سمیتی کے دوسرے کارکنوں کا نام و پتہ بھی معلوم کر لیا اور اُن کی بڑے پیمانے پر تلاشی اور گرفتاری شروع ہو گئی۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا، جب کسان سمیتی کے کسی نہ کسی کارکن یا اس کے ہمدرد کو گرفتار نہ کیا جاتا۔

جس دن رحمت میاں کو دوسرے کارکنوں کے ساتھ گرفتار کیا گیا، وہ رات بھر اُس کے ہاں رہا اور آمنہ کو تسلّی دیتا رہا۔ باپ کی گرفتاری سے آمنہ بہت پریشان تھی اور زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کا رحمت میاں کے علاوہ دنیا میں اور کوئی نہیں تھا، اس لیے وہ اس کا سہارا پا کر بہت تقویت محسوس کر رہی تھی اور اس نے رسمی شرم و حیا کو ترک کر دیا تھا۔ وہ رات بھر اُسے پیار کرتا اور دلاسا دیتا رہا اور صبح ہوتے ہی رحمت میاں اور دوسرے ساتھیوں کو قانونی مدد پہنچانے کے لیے رنگ پور روانہ ہو گیا، جہاں پارٹی کا ایک ایڈوکیٹ اس قسم کے مقدمات کی مفت پیروی کیا کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کسان سمیتی اور پارٹی کے دوسرے رہنماؤں اور کارکنوں کے ساتھ اس کے نام بھی وارنٹ نکل چکا ہے اور پولس اس کی تلاش میں گاؤں میں کئی مقامات پر چھاپے مار چکی ہے۔

یہ اطلاع اس کے لیے بہت پریشان کن ثابت ہوئی، اس لیے کہ آمنہ تنہا تھی اور اُس کا کوئی نگہبان نہیں تھا۔

وہ اسی روز رات کو سیتا رام پور لوٹ گیا اور آمنہ کو سارا حال سُنایا۔ آمنہ یہ سُن کر اور بھی پریشان ہو گئی اور اُس نے اُسے جلد از جلد وہاں سے فرار ہو جانے کا مشورہ دیا۔ پارٹی کی بھی یہی ہدایت تھی کہ جس طرح بھی ہو خود کو محفوظ رکھو اور کسی حال میں گرفتار نہ ہو، لیکن اُس کے

سامنے آمنہ کی حفاظت کا سوال تھا۔ وہ رات بھر آمنہ سے اِس بارے میں مشورہ کرتا رہا، بالآخر اُس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ خواہ گرفتار ہی کیوں نہ ہو جائے، وہ آمنہ کو تنہا اور بے سہارا چھوڑ کر نہیں جائے گا، لیکن آمنہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئی اور اس کے وہاں سے فرار ہو جانے پر اصرار کرتی رہی۔ آمنہ نے اسے سمجھایا کہ وہ اگر یہاں سے نہیں جائے گا تو کسی نہ کسی دن ضرور گرفتار کرلیا جائے گا، اور اگر وہ جیل سے باہر رہے گا تو رحمت میاں اور دوسرے ساتھیوں کی مدد کرسکے گا۔ اُس کے گرفتار ہونے کے بعد ان کی کوئی مدد کرنے والا نہیں رہے گا۔

وہ آمنہ کے اصرار کرنے پر بمشکل گاؤں چھوڑنے پر آمادہ ہوا اور کسان سمیتی کے کارکنوں کی مدد سے سیتا رام پور روانہ ہو گیا۔

"ان باتوں کو کتنے دن گزر گئے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے یہ کل کی باتیں ہیں۔ میں گرفتاری کے خوف سے کئی ماہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور دوسرے گاؤں سے تیسرے گاؤں مارا مارا پھرتا رہا اور پولس میری تلاش میں مختلف مقامات پر چھاپے مارتی رہی۔ میں نے وہاں سے ڈھاکہ جانا چاہا لیکن اس لیے نہ جا سکا کہ ریلوے اسٹیشن، فری گھاٹ اور اسٹیمر پر پولس کی کڑی نگرانی تھی اور وہاں گرفتار ہو جانے کا خدشہ تھا۔ مجھے مشورہ دیا گیا کہ میں چند ماہ کے لیے کلکتے چلا جاؤں اور جب حالات معمول پر آجائیں تو لوٹ آؤں۔ میں تین ماہ تک کلکتے میں رہا اور جب تین ماہ کے بعد سیتا رام پور لوٹا تو وہاں نہ رحمت میاں کی جھونپڑی تھی اور نہ آمنہ کا کوئی سراغ، البتہ اس کی جھونپڑی کی جگہ جلی ہوئی لکڑیوں کا انبار تھا جس سے معلوم ہوا کہ اس کی جھونپڑی یا تو جل گئی ہے یا جلا دی گئی ہے۔ میں نے سیتا رام پور میں آمنہ کو بہت تلاش کیا۔ قرب و جوار کے دیہات میں لوگوں سے رحمت میاں اور آمنہ کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ رحمت میاں ابھی تک سزا کاٹ رہا ہے اور آمنہ کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ ایک دن جوت داروں کے کارندوں نے رات کو رحمت میاں کی جھونپڑی پر حملہ کیا اور آمنہ کو اغوا کرنے کے بعد اس کے گھر میں آگ لگا دی۔ اس کے بعد آمنہ کا کوئی سراغ

ٹیلی پرنٹر پر اس وقت تک کافی تفصیل آ چکی تھی اور غیر ملکی ریڈیو نے بھی اُن خبروں کی تصدیق کر دی تھی، چنانچہ ٹیلی گراف شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا اور ہر شعبے میں بھاگم بھاگ شروع ہو گئی۔ ہر شخص اس بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لیے بے چین تھا۔ بی بی سی، ریڈیو بنگلہ دیش، وائس آف امریکہ اور آل انڈیا ریڈیو کی مسلسل مونیٹرنگ کی جا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے آنکھیں بند کیے اپنی میز پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا ذہن ماضی کی جانب محوِ پرواز تھا۔

اس واقعے کو اتنا عرصہ ہو چکا ہے کہ اب اس کی یادیں بھی دھندلی ہو گئی ہیں۔ آج نہ جانے کیوں اسے اتنے دنوں کے بعد ساری باتیں یاد آ رہی تھیں، حالانکہ آج ان باتوں کے یاد آنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

اسے اپنے غیر بنگالی ہونے کا پہلی بار اس وقت احساس ہوا، جب اس کے چچا نے نہایت رنج کے ساتھ کہا "بیٹا! ہمارا یہاں آنا مناسب نہیں تھا۔ ہمیں اپنا وطن نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔

اُس کے چچا نے جب سے خواجہ شہاب الدین کا بیان پڑھا تھا وہ بے حد افسردہ تھے، اور کلکتے میں اپنا آبائی گھر فروخت کر دینے پر بار بار افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ خواجہ صاحب کے بیان نے انھیں بہت متاثر کیا تھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ اب کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اُن کی طرح سیکڑوں نہیں، ہزاروں خاندانوں نے اپنے خوابوں کی سرزمین کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا اور نئی زندگی شروع کرنے کے لیے نئی سرزمین پر قدم رکھ دیا تھا۔ اب اُن کی واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا اور انھیں

واپس جانے کا مشورہ دیا جارہا تھا، حالانکہ اس ملک کو قائم ہوئے صرف تین سال کا عرصہ ہوا تھا۔ تین سال کے دوران یہ سرزمین اُن کے لیے تنگ ہو چکی تھی۔

اس نے چچا جان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا تھا "چچا جان ان باتوں کی فکر نہ کیجیے۔ اس ملک کے قیام میں ہمارا بھی برابر کا حصّہ ہے، ہمیں کوئی اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔

اُس کی باتوں سے چچا جان کی ڈھارس بندھی یا نہیں، یہ تو اسے معلوم نہیں ہوا، لیکن اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے اور منافرت اور بدگمانی کی فضا قائم ہو چکی ہے۔ عملی سیاست میں حصّہ لینے کی وجہ سے اُس کے کئی تعلیمی سال ضائع ہو چکے تھے، چنانچہ اُس نے اپنی تعلیم مکمّل کرنے کے لیے ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور وہ طلبا کے درمیان پارٹی کا کام کرنے لگا۔

اُسے یونیورسٹی میں داخل ہوئے پہلا سال ہی ہوا تھا کہ بھاشا اندولن شروع ہو گیا اور دوسرے طلبا کے ساتھ وہ بھی اس میں شامل ہو گیا۔ وہ ۲۰ فروری کے طلبا کے اس تاریخی جلوس میں بھی شامل تھا، جس پر سکریٹریٹ کے سامنے گولیاں چلیں اور دو طالب علم ہلاک اور کئی زخمی ہوئے تھے۔ اتفاق سے وہ اس جلوس میں سب سے پیچھے تھا اس لیے وہ زخمی ہونے سے بچ گیا، لیکن وہ اس سانحے کے بعد کئی دنوں تک دیوانہ وار مظاہروں اور جلسوں میں شریک ہوتا رہا اور اس کی کوششوں سے ہی غیر بنگالی دانشوروں نے اردو کے ساتھ بنگلہ کو بھی قومی زبان بنانے کا مطالبہ کیا۔

غیر بنگالی ہو کر بھاشا اندولن میں سرگرم حصّہ لینے کے باعث اُسے بنگالی طلبا میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے یونیورسٹی کے طلبا کا ہر دل عزیز رہنما بن گیا۔ یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کے آخری سال اس کی ملاقات جہاں آرا چودھری سے ہوئی، جو جسٹس منیر احمد چودھری کی اکلوتی بیٹی تھی اور جس نے یونیورسٹی میں اپنی سرگرمیوں اور اپنی شعلہ بار تقریروں کے باعث بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ یوں تو وہ انگریزی میں ایم۔اے کر رہی تھی، لیکن اسے

ادب سے زیادہ سیاست سے دلچسپی تھی، اس لیے وہ یونیورسٹی کی پالٹکس میں پیش پیش تھی اور ہر جگہ اپنی شعلہ بار تقریر کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھی۔ اُس کی جہاں آرا سے شناسائی تو بہت پرانی تھی، لیکن اُسے اس کے قریب آنے کا موقع جگتو فرنٹ کے انتخاب کے موقع پر ملا۔

قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں یہ پہلا انتخاب تھا۔ اصل معرکہ میمن سنگھ میں پیش آنے والا تھا، جہاں وزیرِ اعلیٰ کے مقابلے میں ایک معمولی طالب علم امیدوار تھا اور حزبِ اختلاف کی تمام جماعتیں اس کی حمایت کر رہی تھیں۔ انتخاب سے دو ہفتے قبل اسے یونیورسٹی کے دوسرے طالب علموں کے ساتھ انتخابی مہم میں میمن سنگھ جانے کی ہدایت کی گئی۔ اس کے ساتھ جو طالب علم گئے اُن میں دوسروں کے علاوہ جہاں آرا چودھری بھی شامل تھی، جس نے اپنے ابّو جسٹس منیر چودھری سے بمشکل اجازت حاصل کی۔ جسٹس منیر چودھری نے یوں تو جہاں آرا کو ہر قسم کی سرگرمیوں میں حصّہ لینے کی اجازت دے رکھی تھی لیکن انتخابی مہم میں ڈھاکے سے باہر جانا معمولی بات نہ تھی، لیکن جب جہاں آرا نے بتایا کہ اس سفر میں وہ تنہا نہیں ہے، یونیورسٹی کی دوسری لڑکیاں بھی ساتھ جا رہی ہیں اور وہاں ڈاک بنگلے میں ان کے قیام و طعام کا انتظام ہے تو انھوں نے اجازت دے دی۔

انتخابی مہم میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا نے نہایت سرگرم حصّہ لیا اور ان کی دن رات کی محنت اور پیہم جد و جہد کے نتیجے میں نورالامین کی ایک گمنام طالب علم کے مقابلے میں شکستِ فاش ہوئی اور سارے صوبے میں مسلم لیگ کو زبردست شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ انتخابی مہم کے دوران اسے جہاں آرا کے بہت قریب آنے اور اسے بالکل قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ سب ڈاک بنگلے کے ایک بڑے ہال میں مقیم تھے اور ایک ساتھ کام کر رہے تھے۔ ان کے درمیان تکلّف و حجاب بہت حد تک ختم ہو چکا تھا۔ وہ جہاں آرا کے حسن، اُس کے شباب اور اس کی ذہانت سے نہ صرف متاثر ہوا، بلکہ اپنی پُرکشش شخصیت سے اُسے متاثر کرنے میں بھی کامیاب رہا۔ وہ اگرچہ اُن میں سے نہیں تھا لیکن اُسے امتیاز کرنا بہت مشکل تھا، اس کی

بول چال، لب ولہجہ، خیالات وتصوّرات حتیٰ کہ پہناوا تک اُن جیسا تھا، پھر اس کی پُروقار شخصیت اور وجاہت نے بھی جہاں آرا کے دل میں گھر کر لیا تھا، چنانچہ انتخابی ہنگاموں کے ختم ہوتے ہی ایک دن جہاں آرا نے اُسے اپنے گھر پر مدعو کیا اور جسٹس منیر احمد سے اُس کا باقاعدہ تعارف کرایا۔

جسٹس منیر احمد چودھری ایک ترقی پسند اور لبرل شخص تھے۔ اُن سے مل کر جہاں مجھے خوشی ہوئی، وہاں میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی مجھ سے مل کر کم خوش نہیں ہوئے۔ وہ بے حد عالم و فاضل شخص تھے اور بیک وقت کئی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے، جن میں بنگلہ، اردو اور انگریزی کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی اور فرنچ زبانیں شامل تھیں۔ ان کی نجی لائبریری میں جہاں ایک جانب ٹیگور، نذرل، بنکم، سرت چندر اور جسیم الدین کی کتابیں تھیں، تو دوسری جانب میر، غالب، اقبال، حافظ، بیدل، ملٹن، گیٹے، شیکسپیئر اور دوسرے بہت سارے قدیم وجدید مصنّفین کی کتابیں۔ انھیں قانون، معاشیات، سیاسیات اور تواریخ کے علاوہ فنونِ لطیفہ سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ یہی عالم جہاں آرا چودھری کا تھا، میں نے چوں کہ ان علوم وفنون کے بارے میں تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرلی تھی، اس لیے مجھے گفتگو کے دوران جسٹس منیر احمد چودھری اور جہاں آرا سے شرمندہ نہ ہونا پڑا اور میں جسٹس چودھری اور بیگم چودھری پر اچھا تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہا اور اس طرح میں اور جہاں آرا بڑی باقاعدگی سے ملتے اور ایک دوسرے کے گھر آنے جانے لگے۔ چچا جان نے بھی جہاں آرا کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور ہمارے آزادانہ میل جول نے بالآخر رشتۂ ازدواج کی صورت اختیار کرلی۔ اور جسٹس منیر احمد کو ایک غیر مقامی کو اپنی فرزندی میں قبول کرنے پر اعتراض نہ ہوا۔ اُس وقت فضا اتنی زہر آلود نہیں ہوئی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے تیرہ سال کا عرصہ گزر گیا اور فضا تاریک سے

تاریک تر ہوتی گئی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نے اُس کے خیالات کے سلسلے کو توڑ دیا اور دو بار وقفے وقفے سے گھنٹی بجنے کے بعد مکمّل خاموشی چھا گئی۔ ٹیلی گراف کی کاپی مکمّل ہو چکی تھی اور پریس میں بھیجنے سے قبل اُس پر آخری نظر ڈالی جا رہی تھی۔ لوگ ابھی تک بیٹھے اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔

ایک دن جہاں آرا نے اس سے بڑی رازداری سے کہا "ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے، ورنہ یہ لوگ تمہیں بھی جان سے مار ڈالیں گے۔ تمہاری زندگی یہاں خطرے میں ہے۔"

اُس کی بات سُن کر اُسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"یہاں کس کی زندگی محفوظ ہے جہاں آرا؟"

"لیکن وہ ان لوگوں کو بھی نہیں چھوڑ رہے ہیں، جن کی بیویاں بنگالی ہیں۔"

"ہاں، مجھے معلوم ہے!"

اُس نے گمبھیر انداز میں جواب دیا اور پھر اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ جب سے ہنگامہ شروع ہوا تھا وہ بالکل چپ رہنے لگا تھا۔ وہ ہمیشہ کسی خیال میں ڈوبا رہتا یا پھر اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا۔ خود کلامی اُس کی عادت بنتی جا رہی تھی۔ اُس میں یہ تبدیلی سقوط کے بعد آئی تھی جب اُس نے وسیع پیمانے پر قتلِ عام دیکھا۔ اُسے معلوم تھا کہ بعض بنگالی عورتوں نے اپنے غیر بنگالی شوہروں کو نہ صرف ان کے حوالے کیا، بلکہ انھیں قتل کرنے کی ترغیب بھی دی۔ قوم پرستی کا یہی تقاضا تھا، لیکن جہاں آرا اُن سے مختلف تھی۔ جسٹس منیر احمد چودھری اور بیگم منیر احمد چودھری کو بہاری غنڈوں نے اُن کی کملا پور کی رہائش گاہ میں قتل کر دیا تھا، پھر بھی اُس میں تبدیلی نہیں آئی تھی اور وہ اسے بچانے کے لیے بہت فکر مند تھی۔

جسٹس منیر احمد اور بیگم منیر احمد کے قتل کے بعد اُس کے سوا جہاں آرا کا دنیا میں کوئی نہیں رہا تھا۔ اس کا دل بھی وہاں سے اُچاٹ ہو چکا تھا۔ وہ جلد از جلد وہاں سے چلی آنا چاہتی تھی۔ اُس نے کئی بار اس پر پاکستان چلنے کے لیے زور دیا، لیکن وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔ اُس کی زندگی کا بڑا حصّہ اسی سرزمین پر گزر چکا تھا، اُسے اس سرزمین سے محبّت تھی۔ اُس نے عمر کا باقی ماندہ حصّہ بھی وہیں گزار دینے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن حالات نے اِس کی اجازت نہیں دی۔ اُسے جب ہر جانب سے مایوسی ہوئی اور امید کی کوئی کرن باقی نہ رہی تو اُس نے ایک دن، رات کی تاریکی میں گھر چھوڑ دیا اور وہ جہاں آرا اور بچّوں کے ساتھ کلکتے سے ہوتا ہوا کٹھمنڈو پہنچ گیا۔

رات کے پچھلے پہر

ان تینوں میں فرید اور اُس کے اہلِ خانہ کے بارے میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ دو کا خیال تھا کہ انھیں قتل کر کے اِسی گنّے کے کھیت میں دفن کر دینا چاہیے، جب کہ ایک کا خیال تھا کہ ان سے روپے چھین کر چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ جان بچا کر خود ہی بھاگ جائیں گے۔

سردی کے مارے فرید، اس کی بیوی اور اس کا چار سالہ بچّہ بُری طرح کانپ رہے تھے۔ ان کے جسم پر لباس کے نام پر جو چیتھڑے تھے، وہ دسمبر کی کپکپاتی ہوئی سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی تھے۔ ان کے دانت بُری طرح بج رہے تھے، پھر بھی وہ دانت بھینچے خاموش تھے۔

آسمان بالکل صاف تھا اور چودھویں کا چاند اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ چاندنی میں گنّے کا کھیت، املی اور نیم کے درخت اور کھیت کے درمیان بیل گاڑیوں کی آمدورفت سے خود بخود بن جانے والی سڑک بالکل صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے پورے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا اور یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ لوگ انھیں کہاں لے کر آئے ہیں۔ لاکھ کوششوں کے باوجود وہ یہ نہ جان پایا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟

اُسے صرف اتنا معلوم تھا کہ دیناج پور تک وہ صرف ایک دلّال کے ساتھ آیا تھا۔ اُس سے یہ بات طے پائی تھی کہ وہ اگر اُسے ایک ہزار ٹاکا فراہم کردے تو وہ اسے اور اس کی بیوی اور بچّے کو سرحد پار کروادے گا۔ اس نے ان روپوں کا بہ مشکل انتظام کیا تھا۔ پارتی پور سے بھاگتے وقت اس کی بیوی کے کانوں میں سونے کی صرف دو پتلی پتلی بالیاں رہ گئی تھیں۔ وہ لوگ صرف بدن کے کپڑے میں بھاگ آئے تھے اور رات بھر پیدل چلتے رہنے کے بعد سید پور پہنچے تھے۔ کشیدگی کئی دنوں سے جاری تھی اچانک رات آٹھ بجے ریلوے کالونی کی ایک جانب سے شعلے بلند ہونے لگے اور اسی کے ساتھ شور اور عورتوں اور بچّوں کی آہ و بکا کی آوازیں۔ معلوم ہوا کہ مسلّح دیہاتیوں نے کالونی پر حملہ کردیا ہے اور لوٹ مار اور آتشزنی بڑے پیمانے پر شروع ہوچکی ہے۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سوچتا۔ اس نے بچّے کو گود میں اُٹھایا، زرینہ کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ہجوم کو روکنا ناممکن ہے۔ اگر چند لمحہ بھی ضائع کیا تو زندہ بچنا ممکن نہیں ہے۔ وہ دونوں رات کی تاریکی میں کھیتوں، کانٹے دار جھاڑیوں اور نالوں کو عبور کرتے ہوئے صبحِ صادق کے وقت سید پور پہنچے اور اللہ کے حضور میں سجدہ ریز ہوئے۔

اس دوران مسلسل فاقہ کشی کی نوبت آئی لیکن زرینہ نے اپنی بالیاں نہیں بیچیں۔ اس نے نہایت خاموشی سے بالیاں اتار کر نیفے میں اڑس لیا۔ فرید کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ بالیاں پہنی ہوئی تھی یا نہیں۔ زرینہ کو یہ بالیاں بہت عزیز تھیں۔ اس کی شادی کی یہ آخری نشانی رہ گئی تھی اور وہ اسے خود سے بہ آسانی جدا کرنا نہیں چاہتی تھی، لہٰذا کئی کئی وقت فاقے رہنے کے باوجود اس نے فرید کو یہ نہیں بتایا کہ اس کے پاس بالیاں بھی ہیں۔ جب صورتِ حال بہت زیادہ بگڑنے کے بعد قدرے سنبھلی تو فرید نے اس سے کہا "اب منتقلی کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اپنے وطن واپس چلے جائیں۔ یہاں کی سرزمین ہم پر تنگ ہوچکی ہے۔

اُس نے فرید سے اتفاق کیا۔ زندہ بچ جانے والے اس کے بہت سے عزیز اور شناسا

وطن واپس لوٹ چکے تھے اور بہت آرام سے تھے۔ سوال یہ تھا کہ سرحد کس طرح عبور کیا جائے۔ گرفتار ہونے کے علاوہ ہر جانب جان کا خطرہ تھا اور پھر انھیں راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ فرید نے بتایا کہ اگر ہزار روپے کا انتظام ہو جائے تو دلّال کے ذریعے سرحد عبور کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کا انتظام کہاں سے کیا جائے۔ زرینہ تھوڑی دیر خاموش رہی اور سوچتی رہی، پھر اس نے خاموشی سے اپنے نیفے سے بالیاں نکال کر اس کی ہتھیلیوں پر رکھ دیں۔ فرید کا خوشی کے مارے چہرہ دمک اُٹھا زرینہ بھی ہنسنے لگی اور انھیں ہنستا دیکھ کر اس کا بچّہ بھی ہنسنے لگا، جیسے انھیں کوئی خزانہ مل گیا ہو۔

چند دنوں میں دلّال کا بھی انتظام ہو گیا۔

وہ لوگ جب شام کو دیناج پور اسٹیشن پر اُترے تو ان کے ساتھ صرف ایک دلّال تھا۔ اُنھیں بتایا گیا کہ سرحد یہاں سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے اور اُنھیں رات کی تاریکی میں گھنے کھیتوں سے گزر کر سرحد پار کرنا ہے۔ سرحد کے قریب آخری گاؤں میں دلّال کے ساتھ مزید دو آدمی آن ملے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں رام داؤ تھا اور دوسرے کے پاس پستول۔ زرینہ انھیں دیکھ کر گھبرا گئی اور خوف کے مارے فرید کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اُس نے دلاسا دیا "گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ انھوں نے محض اپنی حفاظت کے لیے یہ سب لیا ہے۔ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

دلّال نے بتایا کہ وہ لوگ اسی کے ٹولے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس سے وہ مطمئن ہو گیا۔

وہ کافی رات تک پیدل چلتے رہے بالآخر وہ سب تھک کر گنّے کے ایک کھیت کے کنارے بیٹھ گئے۔ دلّال نے اس سے کہا "تم لوگ یہاں آرام کرو، صبح کاذب کے وقت یہاں سے روانہ ہوں گے۔"

اس کے بعد وہ تینوں ان سے تھوڑی دور جا کر بیٹھ گئے۔

ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا اور دُور سے کتّوں کے رونے کی مسلسل آوازیں آ رہی تھیں جس سے قریب ہی کہیں گاؤں ہونے کا گمان ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کا کبھی کبھی تیز جھونکا آتا اور

اسی کے ساتھ ان کی گفتگو کا ایک آدھ جملہ سنائی دیتا۔ وہ سنّاٹے میں اُن کی جانب کان لگائے ان کی گفتگو سننے کی کوشش کر رہا تھا اور زرینہ بچّے کو گود میں لیے زمین پر بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ مسلسل چلنے کے باعث وہ تھکاوٹ سے چُور چُور تھی اسی لیے اسے شدید سردی کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔

ایک جملے نے اُسے سر سے لے کر پاؤں تک ہلا کر رکھ دیا اور اس ٹھنڈک میں بھی اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس نے آہستہ سے زرینہ کو بیدار کیا اور اس سے کہا "شاید یہ ہماری زندگی کی آخری رات ہے۔ درود شریف پڑھو اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو"

زرینہ یہ سنتے ہی لرز اُٹھی اور اس سے مزید لگ کر بیٹھ گئی، جیسے اس سے چمٹ کر بیٹھنے سے اس کی زندگی بچ جائے گی۔

وہ جب سے یہاں آکر بیٹھے تھے آسمان سے مُسلسل تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے، جیسے وہ ان کی موت پر نوحہ کناں ہوں۔ اس نے دل میں سوچا "بزرگوں کا کہنا ہے کہ تارے ٹوٹنا موت کی نشانی ہے۔ شاید ان تاروں سے ہم سب کی زندگی وابستہ ہے۔ یہ سوچتے ہی اس پر گہری مایوسی چھا گئی اور اس نے قبلہ کی جانب رُخ کر کے آخری بار نماز پڑھنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے نماز ختم کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی،

اے دو جہان کے پیدا کرنے والے رب، میں نے زندگی میں کبھی کوئی گناہ نہیں کیا، میں نے کسی کا دل نہیں دکھایا۔ میں ہمیشہ نیکی اور دیانت کی راہ پر چلا اور جہاں تک ہو سکا بے یار اور بے سہارا بندوں کی مدد کی، زندگی بھر رزقِ حلال کمایا اور صدق دل سے تیری عبادت کی، تو نے مجھے کڑی سے کڑی آزمائشوں میں ڈالا لیکن میں نے ثابت قدم رکھا اور کبھی نہیں بھٹکا۔ آخر تو مجھے اور میری بیوی بچّے کو کیوں اُٹھانا چاہتا ہے؟ کیوں؟؟ کیوں؟؟؟ صرف تو ہی ہماری حفاظت کرنے والا ہے، تیرے سوا کوئی نہیں"

وہ سجدے میں گر گر زار و قطار روتا رہا اور جب نماز سے فارغ ہوا تو اس کا دل ہلکا ہو چکا تھا۔ زرینہ ابھی تک اس کی جانب سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی، جیسے وہ کچھ جاننا چاہ رہی ہو۔ اس نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا" اللہ نے چاہا تو کچھ نہیں ہو گا، اور اگر اللہ کی یہی مرضی ہے تو ہمیں مرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ وہی زندگی اور موت دینے والا ہے"

اس نے نیلگوں آسمان کی جانب دیکھا۔ تارے ٹوٹنے کا سلسلہ بند ہو چکا تھا۔

ہوا کے جھونکے کے ساتھ ان میں سے ایک شخص کی آواز آئی" اگر انھیں قتل کرنے کی کوشش کی تو میں تم دونوں کو گولی مار دوں گا۔"

دشمن

"ہاں یہ وہی جگہ ہے جہاں مجھے گولی ماردی گئی تھی"۔

اس نے سات گنبد والی مسجد کی جانب دیکھا، پھر اس جگہ کو دیکھا، جہاں اسے دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک صف میں کھڑا کر کے گولی ماردی گئی تھی۔

وہاں پہلے ہی لاشوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ اسے جب دوسرے لوگوں کے ساتھ لایا گیا تو اُسے یقین ہو چکا تھا کہ اب اُس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔

وہ مرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر آمادہ کرنے لگا اور دل ہی دل میں درود پڑھنا شروع کر دیا۔ اس سے قبل جن لوگوں کو یہاں لایا گیا تھا، اُنھیں اسی طرح گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا تھا۔

اچانک ایک ساتھ تڑتڑ گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ اس نے ایک سخت اور گرم سی شے سینے میں اُترتی ہوئی محسوس کی۔ اُس کے سینے سے خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ چند لمحوں میں اس کا ہاتھ گرم لہو سے لت پت ہو گیا اور وہ غش کھا کر گر پڑا۔

اس کے بعد اسے یاد نہیں کیا ہوا۔

اُن کا خیال تھا کہ اِس مقام پر جن دانشوروں کو قتل کیا گیا ہے ان کا بدلہ اسی طرح لیا جا سکتا ہے کہ اُن کی جگہ انھیں قتل کر دیا جائے چنانچہ انھیں وہاں جو بھی ملا پکڑ لائے اور اسے ٹھیک اسی جگہ قتل کر دیا گیا۔

"ان میں میرا عزیز دوست غلام رسول بھی تھا جو "پوربو دیش" میں کام کرتا تھا اور جس سے میری ملاقات پاکستانی فلموں کے میلے کے موقع پر ایف ڈی سی اسٹوڈیو میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے اخبار کی جانب سے میلہ کوَر کرنے آئے تھے۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ ہم تیرا سال کے بعد ایک دوسرے سے مِل رہے تھے۔ تیرا سال قبل ہماری ملاقات راجشاہی سینٹرل جیل میں ہوئی تھی۔ جہاں ہم دونوں نظر بند تھے۔ اتنے دنوں کے بعد ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑے اور بھری محفل میں بغل گیر ہو گئے۔"

اس نے سوچا اور اس کے ذہن میں ماضی کی باتیں کل کی باتوں کی طرح تازہ ہو گئیں۔

تیرا سال کوئی معمولی عرصہ نہیں ہوتا۔ اس دوران دنیا خاصی بدل چکی تھی۔ پاسپورٹ جاری ہونے سے چند ماہ قبل وہ کلکتہ چلا آیا۔ اس کے سارے عزیز و اقارب کلکتے میں ہی تھے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب وہیں رہے گا۔ تیرا سال تک اس نے واپس آنے کے بارے میں سوچا تک نہیں لیکن ایک جُگ بیت جانے کے بعد اسے نہ صرف دوبارہ ترکِ وطن کے بارے میں سوچنا پڑا بلکہ حالات نے اسے آبائی وطن خیرباد کہنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۶۸ء کے حادثے نے اُسے ذہنی طور پر بہت متاثر کیا۔ فساد کے دوران بلوائیوں نے اُس کے گھر کو جلا کر راکھ کر دیا اور اس کے سامنے سوائے ہجرت کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔

غلام رسول نے بتایا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے اور اس کے دو بچے بھی ہیں۔ اس روز

وہ اسے اپنی بیوی بچوں سے ملانے کے لیے زبردستی اپنے گھر لے آیا۔

وہ اس اثنا میں خاصا بدل چکا تھا۔ گھریلو ذمہ داریاں عائد ہو جانے کے باعث وہ عملی سیاست سے علیحدہ ہو چکا تھا لیکن غلام رسول حسبِ معمول سیاست میں سرگرمی سے حصّہ لے رہا تھا اور نہ صرف وہ بلکہ اس کا پورا گھرانا کسی نہ کسی صورت میں سیاست میں شریک تھا۔ اس کی بیوی سکینہ مقامی گرلز اسکول میں ٹیچر تھی اور ساتھ ہی ٹیچرز ایسوسی ایشن کی سکریٹری جنرل بھی۔ اس کی بہن زرینہ سیاسیات میں ایم اے کر رہی تھی اور ساتھ ہی ڈھاکہ یونیورسٹی سنٹرل اسٹوڈینٹس یونین کی مجلس عاملہ کی سرگرم رکن بھی تھی۔ اُس کی امّی اگرچہ ضعیف ہو چکی تھیں، لیکن انھیں سیاست سے اتنی گہری دلچسپی تھی کہ آنکھوں پر دبیز عینک لگائے جب تک پورا اخبار نہ پڑھ لیتیں، انھیں چین نہ آتا۔

غلام رسول نے سکینہ سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا: "اس سے ملو۔ میرا دوست عارف! مَیں تم لوگوں سے اپنے جس دوست کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ یہ وہی عارف ہے۔"

سکینہ، زرینہ اور اس کی ماں نے اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا، جیسے وہ اُس سے اچھی طرح واقف ہوں اور وہ بہت دنوں کے بعد اُن کے گھر آیا ہو۔ اس کے گھر کا ہر فرد اس سے غائبانہ طور پر واقف تھا اور غلام رسول نے انھیں ایک ایک بات تفصیل سے بتا دی تھی۔

اُس نے زرینہ کی جانب غور سے دیکھا۔

وہ خاصی بڑی ہو چکی تھی۔ غلام رسول نے اسے آج سے تیرا سال قبل جب اپنے گھر والوں کی تصویر دکھائی تھی تو زرینہ بہت چھوٹی سی تھی۔ اِس اثنا میں وہ ایک معصوم بچّی سے حسین دوشیزہ بن چکی تھی اور اس میں بلا کی جاذبیت پیدا ہو چکی تھی۔

وہ سب اس سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

ذہنی ہم آہنگی نے اسے غلام رسول اور اس کے گھر والوں کے بہت قریب کر دیا اور اس کے ہاں باقاعدگی سے آتے جاتے رہنے کے باعث وہ اس کے گھر کے ایک فرد

کی طرح بن گیا۔

اِس دوران اس نے محسوس کیا کہ گھر میں اگر کوئی سب سے زیادہ اس سے دلچسپی لے رہا تھا تو وہ زرینہ تھی۔ زرینہ نے اسے پہلے ہی روز اپنی پُروقار شخصیت سے متاثر کیا تھا، اور یہ اس کی دلکش شخصیت تھی جس نے زرینہ کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ زرینہ اگرچہ عمر میں اس سے بہت زیادہ چھوٹی تھی لیکن وہ بے اختیار اس کی جانب کھنچی چلی آ رہی تھی۔ زرینہ سے اُس سے دلچسپی گھر والوں سے پوشیدہ نہیں تھی۔ غلام رسول بھی اس سے کسی حد تک واقف تھا اور اس کی ماں اور سکینہ بھی، لیکن وہ عمداً خاموش تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اگر وہ زرینہ سے رشتہ کا خواہشمند ہے تو اس کی جانب سے سلسلۂ جنبانی ہونی چاہیے۔ اُنھیں اُس پر کامل اعتبار تھا اور اسی لیے انھوں نے زرینہ کو اس سے ملنے جلنے کی آزادی دے رکھی تھی۔

گھر کا ماحول خالص سیاسی ہونے کی وجہ سے ملکی سیاست ہمیشہ موضوعِ گفتگو رہتی۔ گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ کوئی کسی کی تائید کرتا اور کوئی کسی کی۔ پھر اچانک موضوعِ گفتگو بدل گیا۔ اقتدار کی منتقلی اور سیاسی رہنماؤں کے مذاکرات کی ناکامی پر گفتگو ہونے لگی۔

صورتِ حال سے غلام رسول بھی فکرمند تھا اور وہ بھی۔ کشیدہ حالات کے پیشِ نظر ایک دن اُس نے غلام رسول کو تجویز پیش کی۔ اگر وہ سکینہ اور زرینہ کو ماں کے ساتھ چند دنوں کے لیے اس کے ہاں بھیج دے تو مناسب ہے۔ وہاں انھیں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔ حالات کے سُدھرتے ہی انھیں واپس بلا لیا جائے گا۔

غلام رسول کو تجویز پسند آئی اور وہ سب چند جوڑے کپڑوں اور ضروری سامان کے ساتھ اس کے ہاں منتقل ہو گئے۔ اس کی امّی نے غلام رسول کی ماں اور گھر والوں کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور جب تک ہنگامہ جاری رہا۔ وہ سب ان کے ہاں ہی رہے۔ اِس دوران

اسے اور زرینہ کو ایک دوسرے کے اور بھی قریب آنے کا موقع ملا۔

ایک دن جب وہ اپنے کمرے میں بے خبر سو رہا تھا اس نے اپنی پیشانی پر گرم گرم سانس محسوس کی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

اُس نے دیکھا زرینہ عجیب عالم میں اُس کے سرہانے کھڑی ہے اور نہایت گھبراہٹ کے عالم میں اپنی انگلی میں ساری کا پلّو لپیٹ رہی ہے۔

"تم؟ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں؟ کچھ نہیں! کچھ بھی تو نہیں!!" اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا "دراصل مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ آپ سے باتیں کی جائیں۔ اس جگہ میں جب آئی تو آپ بے خبر سو رہے تھے!" اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔

اُس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے سر کو لیتے ہوئے کہا "مجھے تمھارے جذبات کا احساس ہے۔ ذرا امن قائم ہونے دو۔ میں غلام رسول سے بات کروں گا۔"

یہ سنتے ہی زرینہ شرما کر اس کے کمرے سے بھاگ گئی۔

غلام رسول اور اُس کے خیالات ایک جیسے تھے اور خیالات اور نظریات کی ہم آہنگی نے انھیں ایک دوسرے کا گہرا دوست بنا دیا تھا۔ گزشتہ بیس سال سے ان کے درمیان کسی بھی مسئلے پر اختلاف نہیں ہوا تھا لیکن اب وہ شدّت سے محسوس کر رہا تھا کہ غلام رسول نہ صرف اس سے واضح اختلاف کرتا ہے بلکہ اس سے اُلجھ بھی پڑتا ہے۔ بحث کے دوران ایک دن غلام رسول نے ایک ایسی بات کہہ دی، جس نے اُسے حیرت زدہ کر دیا۔

اُس نے کہا ــــ "بہتر ہے کہ تم فوراً مغربی پاکستان چلے جاؤ۔ اگر خانہ جنگی شروع ہوئی تو ہو سکتا ہے کہ تم پر گولی چلانے والا میں پہلا شخص ہوں گا!"

"تو صورتِ حال اس قدر سنگین ہو چکی ہے؟" اس نے دل میں سوچا اور وہ سکتے کے عالم میں آ گیا۔

اُس دن کے بعد اُس نے بہت دنوں تک اُس کے گھر کا رُخ نہیں کیا۔

ایک مدّت کے بعد وہ جب خیریت معلوم کرنے کے لیے اس کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ کسی دوسری جگہ جا چکے ہیں۔

اس کے بعد سے غلام رسول اور اس کے گھر والوں کی کوئی خبر نہ ملی۔

اُس نے نظر اٹھا کر افق کی جانب دیکھا۔

دور دور تک پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔ برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا، ندی کی سطح خاصی بلند ہو چکی تھی اور ندی کی تیز لہریں کنارے سے آ آ کر اپنا سر پٹخ رہی تھیں۔ چھوٹی کشتیاں بادبان لہراتی ہوئی ندی پر سے گزر رہی تھیں۔

اُس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بُلٹ کو ٹٹولا۔

بُلٹ ابھی تک اس کے پاس محفوظ تھی۔ پاکستان سے آتے وقت وہ اسے اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔

اُس نے بُلٹ کو نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھ دیا اور اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

"یہ بُلٹ آج سے ٹھیک دس سال قبل اسی جگہ میرے سینے میں پیوست ہوئی تھی"۔

اُس نے سوچا اور بُلٹ پر لکھے ہوئے اجنبی حروف کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

مُکتی باہنی کے دستے نے جب علی الصباح اُس کے گھر پر دستک دی تو وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس روز اُسے بہت تاخیر سے نیند آئی تھی۔ رات بھر وہ سقوط کے بعد کی صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ سقوط کے بعد ہی بڑے پیمانے پر قتلِ عام شروع ہوا اور وہ بڑی بے چینی کے

ساتھ اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ اسے بار بار غلام رسول کی بات یاد آ رہی تھی: "اگر خانہ جنگی شروع ہوئی تو ہو سکتا ہے تم پر گولی چلانے والا پہلا شخص میں ہوں گا!"

اب غلام رسول ایک شخص کا نام نہیں تھا۔ ایک رجحان، ایک اندازِ فکر اور ایک نسل کا نام تھا۔ ہر شخص غلام رسول بن چکا تھا۔ وہ کسی بھی غلام رسول کے انتظار میں تھا اور انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔

صدر دروازے پر زور زور سے دستک دینے کی آواز سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

صبح کاذب کا وقت تھا۔ مشرقی افق سے ہلکی سی روشنی جھانک رہی تھی۔

اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ نیچے مکتی باہنی کے جوان سب مشین گن اور رائفلز لیے کھڑے تھے۔

اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ لباس تبدیل کیا اور وہ مکتی باہنی کے نوعمر جوانوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ پیچھے اس کی ماں کی آہ و بکا کی آوازیں آتی رہیں۔

سات گنبد والی مسجد میں لاشیں انبار کی صورت میں ایک دن ایک رات پڑی رہیں۔

دوسرے دن صبح کاذب کے وقت رمضو مچھیرا مچھلیاں پکڑنے جال لے کر نکلا تو اس نے لاشوں کے انبار میں کسی شے کو حرکت کرتا ہوا پایا۔ سورج ابھی پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا۔ دھندلکا ہر جانب چھایا ہوا تھا۔ اس لیے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ہلنے والی شے کیا ہے۔ رمضو کے دل میں اشتیاق پیدا ہوا اور وہ ڈرتے ڈرتے لاشوں کے انبار کے قریب پہنچا تو اس نے ایک شخص کو زخمی حالت میں کراہتا ہوا پایا۔

وہ خون میں لت پت تھا۔ اس کے سینے سے رسنے والا خون جم کر سیاہ ہو چکا تھا اور ابھی تک زندگی باقی تھی۔

زمقو نے فوراً محلّے کے ڈاکٹر صمد کو اس کی اطلاع دی جن کے ہاں وہ روزانہ ندی سے پکڑی ہوئی مچھلیاں فروخت کیا کرتا تھا۔ ڈاکٹر صمد محلّے کے بے حد خلیق اور مخلص معالج تھے اور ہر فرقے اور ہر طبقے میں یکساں مقبول تھے۔ انھوں نے فوراً فون پر انڈین آرمی ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی تھوڑی دیر میں انڈین آرمی کی ایمبولنس آئی اور اسے کمبائنڈ ملٹری اسپتال لے گئی جہاں ایک ماہ تک اس کا علاج ہوتا رہا۔

وہ معجزاتی طور پر موت کے منہ سے واپس آگیا۔

آرمی کے سرجن نے اسے بتایا "ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ اتنا خون بہہ جانے کے بعد بھی کوئی شخص زندہ بچ جائے"۔ ڈاکٹر نے اسے یہ بھی بتایا کہ گولی اس کے دل میں لگنے کے بجائے پھیپھڑے میں لگی اور گولی کے پھیپھڑے میں داخل ہوتے ہی اس کا سوراخ خود بخود بند ہوگیا اور اس طرح اس کا خون بہنا بند ہوگیا۔ اس کا زندہ بچ جانا بلاشبہ معجزے سے کم نہ تھا۔

اسپتال سے رخصت ہوتے ہی وہ اپنی ماں اور رخما وتی کے ساتھ پاکستان روانہ ہوگیا

دس سال گزر جانے کے بعد وہ ایک بار پھر یہاں واپس آیا تھا۔ لیکن اس دفعہ اس کے شہری کی حیثیت سے نہیں، سفارت کار کی حیثیت سے۔ وہ سب سے پہلے سات گنبد والی مسجد گیا اور بہت دیر تک وہاں کھڑا ماضی کے مزار پر پھول چڑھاتا رہا۔ محمد پور بالکل بدل چکا تھا۔ وہاں اسے کوئی شناسا چہرہ نہیں ملا۔

وہ بہت دیر تک سڑکوں پر بے مقصد گشت کرتا رہا۔ اچانک اس کے کان میں آواز آئی "شونو"

اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

زرینہ ایک چھ ماہ کے بچّے کو گود میں لیے کھڑی تھی اور اس کا پانچ سالہ بچّہ اس کی ساڑی

کا پلّو پکڑے کھڑا تھا۔

اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

"زرینہ تم؟" مارے خوشی اور حیرت کے اس کی زبان گُنگ ہوگئی۔

"وادا آپ کہاں؟ اتنے دنوں کہاں رہے؟" خوشی کے مارے زرینہ کی آواز حلق میں پھنس گئی "یہ چلیے، میرے گھر چلیے، یہیں چند گز کے فاصلے پر ہے۔"

زرینہ اسے زبردستی اپنے گھر لے آئی۔ جیسے آج سے کئی سال قبل غلام رسول اسے اپنے گھر لایا تھا۔

دونوں بہت دیر تک ماضی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

زرینہ نے بتایا، غلام رسول چھاپہ مار جنگ کے دوران کام آیا اور اس کی ماں بیٹے کے غم میں انتقال کر گئی۔ وہ سکینہ کے ساتھ ایک مقامی اسکول میں پڑھاتی ہے اور اس نے اپنے ایک دور کے رشتہ دار سے شادی کر لی ہے۔

اس نے چائے اور ناشتے کے بعد اپنی شادی کی تصویریں دکھانے کے لیے اس کے ہاتھ میں البم تھما دیا۔

البم کھولتے ہی اُس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں!

اُس کے سامنے فوجی وردی میں مکتی باہنی کے ایک کمانڈر کی تصویر تھی۔ اُس کمانڈر کی آنکھیں چیختے ہوئے حکم دیا تھا "اڑا دو گولیوں سے ان سُور کے بچّوں کو!"

اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک ساتھ تڑتڑ بہت ساری گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں اور اس نے ایک سخت اور گرم سی شے اپنے سینے میں اترتی ہوئی محسوس کی۔

(تخلیقی ادب ۱۹۸۰ء)

پچھتاوا

گفتگو کے دوران وہ لاجواب ہو کر رہ گیا اور جواب دینے کے بجائے اس کے الفاظ پر غور کرنے لگا۔

"وہ درست کہہ رہا ہے۔ جڑیں یہاں نہیں ہیں۔"

سپر ہائی وے پر بس پوری رفتار سے رواں تھی۔ وہ اپنے بغل میں بیٹھے ہوئے نوجوان سے الجھنے کے بجائے اس کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ وہ جب پہلی بار مشرقی خطّے میں پہنچا تو اس سے وہاں بھی یہی کہا گیا تھا۔ وہ سوچ میں غرق ہو گیا۔

اسے اپنے ایڈیٹر کے الفاظ یاد آئے۔

"آپ سمجھتے ہیں کہ آپ جن مسائل سے بھاگ کر جا رہے ہیں، وہ آپ کا تعاقب نہیں کریں گے؟ آپ خوش فہمی میں مبتلا ہیں جناب، خوش فہمی میں۔"

وہ جب روانگی سے قبل اپنے بھائی سے ملنے گیا تو انھوں نے اُسے پُرنم آنکھوں سے رخصت کرتے ہوئے کہا، "آخر تم نے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا، لیکن یاد رکھنا تم وہاں کبھی خوش نہیں رہو گے۔"

اس نے اس وقت بھائی کی باتوں کو ہنس کر اڑا دیا تھا۔ اس وقت اس پر ترکِ وطن کا جنون سوار تھا۔ اسے وہاں کی ہر چیز میں عیب نظر آ رہا تھا۔ وہ نئی سرزمین میں آ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بہت خوش

تھا۔ اتفاق سے اُسے پہنچتے ہی اخبار میں ملازمت مل گئی۔ معاشی تحفّظ کے ساتھ ساتھ اسے وہاں ایک جیسا ماحول بھی مل گیا۔ آج کے مقابلے میں اگرچہ تنخواہ قلیل تھی، لیکن سستے کا زمانہ تھا اور زندگی پُرسکون اور خوش گوار تھی۔ وہ اپنی نوبیاہتا بیوی کے ساتھ بہت خوش تھا۔ اسے اب اس کا اندیشہ نہیں تھا کہ اچانک فساد ہوگا اور وہ سب قتل کر دیئے جائیں گے۔ عدم تحفظ کا احساس ختم ہو چکا تھا اور وہ اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اخبارات میں اور اخبارات کے باہر جلد ہی اس کے دوست و احباب پیدا ہو گئے۔ وہ صرف صحافی نہیں، ادیب بھی تھا، اس لیے اس کے احباب کا حلقہ تیزی سے بڑھتا گیا، جس میں دونوں زبانیں بولنے والے شامل ہوتے گئے۔ اس کی وجہ اس کی بنگلہ زبان سے واقفیت بھی تھی۔ جس نے اسے بہت جلد مقامی لوگوں میں مقبول بنا دیا اور وہ ان میں اس طرح گھُل مل گیا جیسے وہ انہی میں سے ہو۔ وہ نہ صرف ان کی زبان و ادب کا عاشق تھا بلکہ ان کی تہذیب و ثقافت کا بھی احترام کرتا تھا اور وہ ان مطالبوں کی کھل کر حمایت کرتا تھا، جو گاہے گاہے ان کی جانب سے اٹھائے گئے تھے۔ صحافت تو اس کا پیشہ تھا ہی، انگریزی اخبار سے وابستہ ہونے کے باعث وہ چند دنوں میں ہر حلقے میں پہچانا جانے لگا اور اس کی پرکشش شخصیت اور ملنسار طبیعت کی وجہ سے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا صوبے کے مقتدر صحافیوں میں شمار ہونے لگا۔ بنگالی طبعاً بائیں بازو کا ہوتا ہے۔ بائیں بازو کے رجحان نے اسے اخباری حلقوں میں اور بھی مقبول بنا دیا اور وہ جلد ہی فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کا نائب صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس طرح اس کا سیاست سے بالواسطہ تعلق قائم ہو گیا اور وہ ان کی سیاسی اور ٹریڈ یونین تحریکوں میں بھی حصّہ لینے لگا۔ وہ جس خطّے سے آیا تھا وہاں یہ سب عام باتیں تھیں۔ وہ وہاں بھی سیاسی اور ٹریڈ یونین تحریکوں میں حصّہ لیتا رہا تھا، جس کی پاداش میں اسے کئی بار پولس کی لاٹھیاں کھانی پڑیں۔ اس نے پولس پر پتھر بھی برسائے اور جیل کی ہوا بھی کھائی، لیکن یہ سب شادی سے پہلے کی باتیں تھیں۔ شادی کے بعد ازدواجی زندگی کی ذمّے داریوں نے اسے ان سرگرمیوں سے بہت دور کر دیا تھا، لیکن نئی سرزمین میں آنے اور نئے ماحول میں رچ بس جانے کے بعد اس نے پھر ان سرگرمیوں میں حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اسے یہاں بھی وہی ماحول میسّر آگیا تھا جس میں اس کی ذہنی نشوونما ہوئی تھی۔

اس کا جلد ہی طٰہٰ سے رابطہ قائم ہو گیا۔ جس سے اس کی پہلی ملاقات راج شاہی سینٹرل جیل میں ہوئی تھی جہاں وہ کسان رہنما کرشن بنودرائے کے ساتھ گرفتار ہو کر وہاں پہنچا تھا۔ بائیس سال پُرانے

دوست جب ایک دوسرے بغل گیر ہوئے تو ماضی کی تمام یادیں تازہ ہوگئیں۔ طٰہٰ اس عرصے میں انڈر گراؤنڈ پارٹی کا بہت اہم رہنما بن چکا تھا۔ اس نے اسے تجویز پیش کی کہ وہ اُسے اس کے گھر پر پارٹی کی خفیہ میٹنگ کرنے کا موقع فراہم کرے۔ وہ غیر بنگالی ہے اور بیوی بچّوں والا بھی، اس کے گھر پر میٹنگ ہونے سے کسی کو شبہ نہیں ہوگا، لیکن وہ اتنا بڑا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ طٰہٰ نے اسے پہلے کی طرح پارٹی سرگرمیوں میں بھی شامل کرنا چاہا، لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے جب سے شادی کی تھی۔ وہ بہت محتاط ہو گیا تھا اور اپنی وجہ سے بیوی بچّوں کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یوں بھی اسے پارٹی سے قطع تعلق کیے بارہ سال ہو چکے تھے۔ وہ ایک ہمدرد کی حیثیت سے پارٹی کی مالی امداد تو کر سکتا تھا، لیکن کام نہیں۔ اب وہ جیل کی صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا اور ایسی سرگرمیوں سے دور رہنا چاہتا تھا، جس کے نتیجے میں اسے جیل جانا پڑے۔ سیاست سے دلچسپی رکھنے کے باوجود وہ انقلابی سرگرمیوں سے دور تھا اور صرف عوام کے حقوق کی بازیابی کی جدوجہد میں شامل رہنا چاہتا تھا۔

وہ اس جدوجہد میں اس وقت تک شریک رہا، جب تک فوجی ایکشن نہیں ہوا۔ جس کے بعد بغاوت پھوٹ پڑی اور خانہ جنگی کے دوران اسے مجبوراً اپنی بیوی بچّوں کے ساتھ محمد پور میں پناہ لینی پڑی۔ وہ جس محلّے میں تھا وہ بہت ہی مخدوش تھا۔ اس محلّے سے بحفاظت نکلنے والا اس کا آخری گھرانہ تھا۔ اس کے بعد وہاں کسی غیر بنگالی کو زندہ نہیں دیکھا گیا۔

صورتِ حال کے سنبھلتے ہی اس نے اپنی بیوی بچوں کو کراچی منتقل کر دیا اور خود وہاں رہ گیا۔ ایسے موقع پر جبکہ پورا ملک مہیب خانہ جنگی میں گھرا ہوا تھا وہ راہِ فرار اختیار کرنا بزدلی سمجھتا تھا۔ اسے اس سرزمین سے پیار تھا اسی لیے اس نے مصیبت کے وقت اسے نہیں چھوڑا اور وہ اس وقت تک اپنے فرائض انجام دیتا رہا جب تک سقوطِ ڈھاکہ کا اعلان نہیں ہوا۔ سقوط کے ساتھ ہی اسے پاکستانی فوج سے تعاون کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ یہ قطعی اتفاق تھا کہ طٰہٰ اپنے مسلح دستے کے ساتھ گشت کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ وہ دیگر پانچ آدمیوں کے ساتھ ایک قطار میں کھڑا تھا۔ سب کے ہاتھ پیچھے کی جانب بندھے ہوئے تھے۔ اس سے قبل کئی لوگ گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ زندہ نہیں بچے گا۔ اسے اچانک اپنے بیوی بچوں کا خیال آیا اور اس نے

درود پڑھتے ہوئے خدا سے دعا مانگی "یا اللہ، میری مدد کر۔ میرے بعد میری بیوی، بچوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔"

طہٰ نے اسے قطار میں دیکھتے ہی پہچان لیا اور وہ چھلانگ لگا کر جیپ سے اُتر گیا۔ اس کے ساتھی بھی اس کے ساتھ اُتر گئے۔

"یہ شخص ہمارے کام کے لیے کام کرتا رہا ہے، اسے نہ مارو۔"

"سب سالے بہاری ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔"

"نہیں، میں اسے پہچانتا ہوں، اسے میرے حوالے کر دو، یہ شخص بے قصور ہے۔"

"تمھیں کیسے معلوم کہ یہ شخص بے قصور ہے۔"

"میں اسے جانتا ہوں۔"

ان کے درمیان تھوڑی دیر تکرار ہوتی رہی۔ بالآخر طہٰ نے گرج کر کہا "اگر تم نے اسے میرے حوالے نہیں کیا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔"

اس کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی اور اس نے اس کی نالی ان کی جانب تان رکھی تھی۔ طہٰ کے ساتھیوں نے بھی صورت حال کو تاڑتے ہوئے فوراً اپنی رائفلیں اور سب مشین گنیں لوڈ کر لی تھیں۔ مکتی باہنی کا دستہ گن باہنی کے نرغے میں تھا اور ایک غیر شخص کے لیے کسی بھی لمحے جھڑپ ہو سکتی تھی۔ مکتی باہنی کے نوجوان کمانڈر نے طہٰ کا تیور دیکھ کر اُسے اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا "اچھی بات ہے، میں تم سب کو دیکھ لوں گا۔"

"دیکھ لینا، پہلے اسے میرے حوالے کرو۔"

طہٰ اسے ان کے چنگل سے چھڑا کر سیدھے ڈھاکہ سینٹرل جیل لے گیا اور اسے جیلر کے حوالے کرتے ہوئے اس سے کہا "جب تک صورتِ حال بہتر نہ ہو، تمھارا یہاں رہنا ضروری ہے۔ میں گاہے گاہے تم سے ملتا رہوں گا۔"

طہٰ چلا گیا اور ایک ہفتے کے بعد آ کر اُسے اپنے ساتھ سرحد تک لے گیا اور اُسے اپنے سامنے سرحد عبور کرا دیا۔

کلکتے پہنچنے کے بعد اس نے اپنے کسی پرانے دوست یا رشتے دار سے ملاقات نہیں کی کہ کہیں انٹیلی جنس کو اطلاع نہ ہو جائے، اس نے آتے وقت صرف بھائی اور بھاوج سے ملاقات کی اور اسمگل ہو کر کٹھمنڈو

پہنچ گیا۔ وہ جلد از جلد پاکستان پہنچنا چاہ رہا تھا، جہاں اس کی بیوی بچے بے قراری کے ساتھ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ پاکستانی سفارت خانے کے ایک دوست کی مدد سے پاکستان پہنچ گیا، اور اطمینان کا سانس لیا۔

اسے یہاں آئے سولہ سال ہو چکے تھے۔ وہ اپنے وطن کی طرح اس سرزمین کو بھی بھول جانا چاہتا تھا جہاں اس نے زندگی کے بہترین دن گزارے تھے، لیکن اس نوجوان نے اس کی یادیں تازہ کر دی تھیں۔ وہ عمر بھر خوش فہمیوں میں مبتلا رہا۔ اس نے اپنے بزدل خیالات کے باعث کبھی اس بارے میں غور نہیں کیا لیکن اس کے غور کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے، حقیقت اپنی جگہ قائم تھی۔

اس نے اپنے ہم سفر نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا "اس نے صحیح کہا ہے، ساری عمر خوش فہمیوں میں تو نہیں گزاری جا سکتی۔"

وہ ایک مدت کے بعد اپنے چچا زاد بھائی سے ملنے خیرپور گیا تھا، جو بہت مدت قبل یہاں آ کر بس گئے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے یہاں کی بنجر زمین کو زرخیز بنایا تھا۔ خاندان بھر کی مخالفت کے باوجود یہیں اپنے ایک مقامی دوست کی بہن سے شادی کر لی تھی۔ ان کے سارے بچے یہیں پیدا ہوئے۔ یہیں پلے، بڑھے اور تعلیم حاصل کی۔ انھیں یہاں آباد ہوئے اڑتالیس سال گزر چکے تھے۔ بول چال، رہن سہن اور رسم و رواج سب کچھ بدل چکا تھا۔ اسے اپنے بھائی کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انھوں نے کس طرح سب کچھ بدل ڈالا کہ ان کی شناخت تک مشکل ہو گئی۔ وہ انھیں دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوا کہ وہ نہ سہی اس کے بھائی نے تو اپنی شناخت بدل ڈالی، لیکن اسے اس وقت بڑا تعجب ہوا جب اس کے بھائی نے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا "بعض دفعہ سوچتا ہوں، ہمارا یہاں آنا درست نہیں تھا۔"

"درست نہیں تھا؟" اس کا دل دھک سے رہ گیا "کیا وہ بھی اپنے فیصلے پر پچھتا رہے ہیں؟ اتنے دنوں کے بعد؟"

اس نے بھائی کے چہرے کی طرف حسرت سے دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا کر رخصت ہو گیا۔

(۲۲ جولائی ۸۵ء)

اب ہم کہاں جائیں گے ماں

اس واقعے کو کتنے دن گزر گئے! شاید سولہ سال یا شاید اس سے بھی زیادہ! لیکن آج بھی یہ واقعہ اُس سے بھلائے نہیں بھولتا، حالانکہ اس نے کئی بار اس واقعے کو ذہن سے کھرچ کر نکال دینے کی کوشش کی، لیکن وہ ہمیشہ ناکام رہا اور رہ رہ کر سال دو سال کے بعد اور کبھی کبھی تین سال کے وقفے سے اُسے یہ واقعہ یاد آتا رہا، جیسے وہ اس کی زندگی کا جُز بن چکا ہو۔ زندگی میں بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جو مرتے دم تک انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور سائے کی طرح تعاقب کرتے رہتے ہیں۔ شاید یہ واقعہ بھی ایسا ہی تھا۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی اسے نہیں معلوم، کوئی اس کی اصل شناخت سے واقف نہیں تھا۔ سب اسے اپنوں میں سے سمجھتے تھے اس لیے کہ وہ شکل و صورت، بات چیت، رہن سہن ہر اعتبار سے ان جیسا تھا۔ اس نے تعلیم بھی اُنھی جیسی پائی تھی اور اُنھی کے ساتھ پل کر بڑا ہوا تھا۔ اس کی گفتگو اور اس کے لب و لہجے سے ممکن نہ تھا کہ کوئی اس کی اصلیت کے بارے میں شبہ کرتا۔ اس کی پرورش ہی اس طرح کی گئی تھی کہ وہ ان میں گھُل مل گیا تھا، لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔ وہ ان جیسا ہو کر بھی ان میں سے نہیں ہے۔ اس کی ماں نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس روز وہ جب ریس کورس میں دوسرے لوگوں کے ساتھ اکٹھا ہوا تو کسی کو اس پر شبہ نہیں ہوا۔ وہ بھی ان جیسے لباس میں ملبوس تھا اور

محض تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا تھا۔

بریگیڈیر قادر اور ان کی باہنی نے لاؤڈ اسپیکر پر لوگوں سے ریس کورس میں جمع ہو جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہاں کیا ہونے والا ہے۔ بریگیڈیر قادر نے غیر ملکی اخباری نمائندوں کو ملک دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارے جانے والوں کی فلم بندی کی اجازت دے دی تھی۔ اس لیے سارے غیر ملکی اخباری نمائندے ریس کورس میں جمع ہو چکے تھے۔ سب سے آگے پریس فوٹو گرافر اور ٹی وی کیمرہ مین تھے، ان کے آگے سنگین بردار قادر باہنی اور ان کے سامنے زمین پر لیٹے ہوئے مجرمین، جو لنگی اور بنیائن میں ملبوس تھے تاکہ کوئی انھیں شناخت نہ کر سکے۔ لیکن انھیں پہچان لیا گیا تھا۔ ان کے ہاتھ پیچھے کی جانب بندھے ہوئے تھے۔ تماشہ شروع ہونے سے قبل ان کے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیئے گئے اور اسی کے ساتھ قادر باہنی کو ایکشن کا حکم دے دیا گیا۔ موت کے چنگل میں پھنسے ہوئے نصف درجن لوگوں نے گھبرا کر ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش کی، لیکن ہر جانب سے سنگین بردار باہنی ان پر حملہ آور ہوئی اور انھیں سنگینوں سے کچوکے دینے لگی۔ وہ تھک کر اور ڈر کے مارے زمین پر گر پڑے اور انھیں سنگین سے کچوکے دے کر اذیتیں پہنچانے کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی کے ساتھ ان کی آہ و بکا فضا میں گونجنے لگی۔ مستعد پریس فوٹو گرافروں اور ٹی وی کیمرہ مینوں نے سارے مناظر فلم بند کر لیے اور اسی کے ساتھ مجمع خوشی سے نعرے لگانے لگا۔ یہ تماشہ کل بیس منٹ جاری رہا اور دشمن کی فوج سے تعاون کرنے والے مجرموں کی موت کے ساتھ ہی تماشہ ختم ہو گیا۔ چند لمحوں میں بھیڑ چھٹ گئی۔ پریس فوٹو گرافر اور ٹی۔ وی کیمرہ مین اپنے اپنے سفارت خانے اور ہوائی اڈے روانہ ہو گئے تاکہ وہ اپنی ان نادر اور بیش قیمت تصویروں کو جلد از جلد اپنے اخباروں اور ٹی وی سنٹروں کو پہنچا سکیں۔ ایسی ایکشن فلم انھیں ویت نام کی جنگ کے بعد پہلی مرتبہ بنانے کا موقع ملا تھا اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

اس نے یہ سارا منظر حیرت اور استعجاب کے عالم میں دیکھا اور اتنا متاثر ہوا کہ کئی دنوں تک شدید بخار میں مبتلا رہا۔ اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے ہجوم نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور وہ بھی دوسروں کے ساتھ زمین پر لیٹا ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ پیچھے کی جانب بندھے ہوئے ہیں اور اُسے ہر طرف سے برچھوں سے کچوکے لگائے جا رہے ہیں اور وہ چیخ رہا ہے "مجھے نہ مارو، مجھے نہ مارو، میں بے قصور ہوں" وہ بخار کے عالم میں بار بار چیخ کر اُٹھ بیٹھتا اور اس کی ماں اسے تکیے پر لٹا دیتی۔

اس کی یہ کیفیت تین چار دنوں تک جاری رہی۔

وہ جب صحت یاب ہوا تو اسے یہ منظر خواب میں دکھائی دینے لگا۔ وہ نیند میں پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ اس کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگتیں اور وہ ایک دم گھبرا کر بیدار ہو جاتا اور اس کی ماں اس کیفیت سے پریشان ہو جاتی۔ وہ درود پڑھ کر دم کرتی۔ مولوی صاحب کا دم کیا ہوا پانی پلاتی اور اسے شاہ صاحب کی دی ہوئی تعویذ پہناتی، لیکن اس کی حالت سنبھلنے کے بجائے مزید بگڑ جاتی اور وہ اپنی ماں کے سینے سے لگ کر کہتا "ماں، یہاں سے چلو، اب یہاں رہنا ممکن نہیں"۔

اس کی ماں اسے دلاسا دیتی "ہاں بیٹے، ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں گے، تم تندرست ہو جاؤ، ہم لوگ بہت جلد یہاں سے چلے جائیں گے"۔

اسے ماں کی باتوں پر یقین آگیا اور وہ نہایت تیزی سے صحت یاب ہونے لگا۔ اس کی ماں نے زندگی بھر ایک ایک پیسہ اکٹھا کر کے جو رقم جمع کی تھی اور زیور، کپڑے اور گھر کا سامان بیچ کر جو کچھ جمع کیا تھا وہ دونوں کے سرحد عبور کرنے کے لیے کافی تھا۔ ایک روز ماں اور بیٹے نے دلال کے ذریعے خاموشی سے سرحد عبور کر لی اور دیناج پور سے پورنیا ہوتے ہوئے دونوں کٹھمنڈو پہنچ گئے، جہاں پہلے ہی بہت سے لوگ پاکستان جانے کے منتظر تھے۔ اس کی ماں کو وہاں سے روانہ ہوتے وقت بہت دکھ ہوا۔ اس کے شوہر کی قبر وہیں تھی اور اس نے انتقال کے وقت وصیت کی تھی کہ وہ اس سرزمین کو چھوڑ کر کہیں اور نہ جائے اور اس نے اپنا وطن چھوڑ کر جو غلطی کی ہے، اس کی اولاد یہ غلطی ہرگز نہ کرے، لیکن وہاں کی سرزمین ان پر تنگ ہو چکی تھی اور سوائے ترکِ وطن کے ان کے سامنے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ شوہر کی ہدایت کے مطابق اس نے سب کچھ کیا، جس کے تحت بادل کا وہاں ضم ہو جانا ممکن ہو۔ اس کے لیے یہ کام اس لیے بھی آسان تھا کہ وہ خود اسی ماحول کی پروردہ تھی، لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کا بیٹا سیانا ہو چکا ہے اور ساری باتیں سمجھنے لگا ہے تو اس نے شوہر کے بجائے بیٹے کی بات پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ روانگی سے قبل بادل کے ساتھ اپنے شوہر کی قبر پر گئی۔ آخری بار فاتحہ پڑھا اور روتے ہوئے اس کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

اب ماں بیٹے کو یہاں آئے ہوئے کافی دن ہو چکے تھے۔ بادل کافی بڑا ہو چکا تھا اور وہ کاٹن ملز میں کام کرنے لگا تھا۔ اس نے دن رات محنت کر کے شہر کی مضافات میں ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا

ایک روز جب وہ گھر لوٹ رہا تھا تو اس نے پھر وہی منظر دیکھا، بالکل اسی طرح لوگ گھیرا ڈال کر لوگوں کو سر پر، ڈنڈے اور رائفل کے دستے سے مار رہے تھے اور مار کھانے والوں کی آہ و بکا فضا میں گونج رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس میں مردوں کے ساتھ عورتیں اور بچے بھی شامل تھے اور مارتے پیٹنے کے بعد انھیں گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ ٹھیک چوک پر اسے بس سے گھسیٹ کر نیچے اتار لیا گیا اور اس پر ہر طرف سے مکّوں اور لاٹھیوں کی بارش شروع ہو گئی اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ وہ زندہ کس طرح بچ گیا اُسے نہیں معلوم۔ اسے جب ہوش آیا تو وہ عباسی شہید ہسپتال میں داخل تھا۔ ساتھی زخمیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ اسے پولیس ہسپتال میں پہنچا گئی ہے۔ اس کی ماں کسی طرح سلامت رہ گئی اور اسے تلاش کرتی ہوئی ہسپتال پہنچی اور اسے زندہ دیکھ کر بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ اس نے ماں سے بے اختیار پوچھا "اب ہم کہاں جائیں گے ماں؟"

(۱۶۔ اگست ۸۷ء)

اذیّتوں کی شاخ در شاخ پھیلی ہوئی رات

"اب تم آزاد ہو، جہاں جانا چاہو جا سکتے ہو۔ ہم تمہارے لیے ریلوے پاس بنا دیں گے۔ یہ رہی تمہارے راستے کے خرچ کے لیے رقم" جیلر نے اس کی جانب دس دس کے پانچ نوٹ اور رسید بڑھاتے ہوئے کہا۔ "رقم کی وصولی کے لیے یہاں دستخط کر دو۔"

"جہاں جانا چاہوں جا سکتا ہوں؟ سفر کے لیے پاس بنا دیا جائے گا؟ لیکن میں کہاں جاؤں؟" اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔

وہ کہاں جائے گا، یہ تو اُسے بھی معلوم نہیں۔ وہ آزاد تھا، لیکن اس کے سامنے کوئی منزل نہ تھی۔ اسے گاؤں سے ترپتی کا جو آخری خط ملا تھا، اس میں اس نے لکھا تھا فائرنگ کی خبر سنتے ہی اس کی ماں کا صدمے سے انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی زمین اور اس کی جھونپڑی مہاجن نے عدالت سے قرق کروا لی ہے۔ اب وہ آئے گا تو وہاں کچھ نہیں پائے گا۔"

"گاؤں جا کر کیا ہو گا؟ وہاں کون اس کا انتظار کر رہا ہے؟ انتظار کرنے والی ہستی تو بہت دن قبل گزر چکی۔ پھر وہاں جا کر کیا حاصل؟"

وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

جیلر نے پھر دریافت کیا "تم کیا سوچ رہے ہو؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"میں کہاں جانا چاہتا ہوں؟" اس نے زیرِ لب اپنے آپ سے سوال کیا اور اپنے پاؤں کی جانب دیکھنے لگا۔ جیل کے دھاری دار پاجامے میں اس کا صرف ایک پاؤں نظر آ رہا تھا، جس میں جیل کا تیار کردہ چپّل تھا اور دوسرا پاؤں غائب تھا۔ وہ بیساکھی کے سہارے کھڑے کھڑے تھک چکا تھا۔ جیلر کو اتنا احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر سے بیساکھی کے سہارے کھڑا ہے۔ اب وہ نظر بند نہیں ایک آزاد اور باعزت شہری ہے۔ اسے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہنے سے اس کی عزت میں کوئی کمی نہیں ہوتی، لیکن وہ ظلم کی چکّی کا ایک ایسا بے حس پُرزہ تھا جس کے تمام احساسات ختم ہو چکے تھے اور وہ اس سے مسلسل سوال کیے جا رہا تھا۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ نہیں یہیں رہوں گا۔"

"پاگل ہو گئے ہو۔" اس نے حیرت سے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ حکّام نے تمھیں رہا کرنے کی ہدایت کی ہے۔ تم اب یہاں نہیں رہ سکتے۔ لوگ تو رہا ہونے کے لیے جان دیتے ہیں، خوشامدیں کرتے ہیں، باؤنڈ تک لکھ دیتے ہیں اور تم ہو کہ رہا ہونا نہیں چاہتے۔" جیلر نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا

"تمھیں ہر حال میں جانا پڑے گا۔ میں تمھیں صرف آج رات یہاں گزارنے کی اجازت دے سکتا ہوں، اور بس۔"

جیلر نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور وارڈن کو اُسے بیرک میں واپس لے جانے کی ہدایت کی۔

وہ بیساکھی کے سہارے آہستہ آہستہ وارڈن کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

بیرک میں اس کے ساتھی نہایت بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ وارڈن نے انھیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ نور الٰہی کو بڑے صاحب نے گیٹ میں طلب کیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ آج ہی رہا کر دیا جائے۔ اس کی رہائی کی خبر آناً فاناً سب کو ہو گئی۔ اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ وہ آج ہی رہا کر دیا جائے گا اور اُسے شاید بیرک واپس آنے کا موقع نہ ملے اور اس کا سامان گیٹ پر ہی منگوا لیا جائے، لیکن انھوں نے اُسے جب واپس آتے ہوئے دیکھا تو ان کے چہرے پر مایوسی چھا گئی اور وہ نہایت تیزی سے اس کی جانب بڑھے۔

اس نے انھیں بتایا "میرا ریلیز آرڈر آ چکا ہے۔ مجھے کل صبح یہاں سے جانا ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ دھم سے اپنی بیساکھی سمیت پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ صدر دروازے سے یہاں آتے

ہوئے بہت تھک چکا تھا۔ اس کے ساتھی اس کی رہائی پر خوشی کا اظہار کرنے لگے اور ساتھ ہی اپنے اپنے گھروں، بیوی بچوں اور رشتے داروں کے نام اور پتے بتانے لگے تاکہ وہ ان سے مل کر یا انھیں خط لکھ کر ان کی خیر بتا سکیں۔ انھیں نظر بند ہوئے کتنا عرصہ بیت چکا تھا۔ شاید دو سال یا شاید تین سال۔ چار سال بھی ہو سکتا ہے۔ انھیں یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ صحیح معنوں میں کب گرفتار ہوئے اور انھیں کب غیر معینہ مدت کے لیے نظر بند کر دیا گیا۔ طویل نظر بندی اور قید تنہائی کے باعث بعض نظر بند پاگل ہو چکے تھے اور بعض نیم پاگل یا سنکی، اور جو دماغی اعتبار سے صحت مند تھے وہ محض اس لیے تھے کہ انھیں اپنے آدرش پر پختہ یقین تھا اور وہ مرتے دم تک ثابت قدم رہنے کا عزم کر چکے تھے۔ ان میں سے بعض اتنے طویل عرصے سے نظر بند تھے کہ وہ اگر عام مجرموں کی طرح کسی کو قتل کر دیتے تو بھی وہ معمول کی سزا کاٹ کر رہا ہو چکے ہوتے۔ ان میں وہ پہلا شخص تھا جسے رہا کیا جا رہا تھا اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ اپاہج ہو چکا تھا اور اس سے کسی قسم کا خطرہ نہیں رہا تھا۔

اس کے بیرک میں داخل ہوتے ہی وارڈن نے سیٹی بجانی شروع کر دی، جس کا مطلب تھا اب کھیل کود، ورزش اور چہل قدمی بند کر دو اور پنجرے میں بند ہو جاؤ، حالانکہ ابھی سورج غروب ہونے میں کافی دیر تھی اور شام کا دھندلکا بھی نہیں چھایا تھا، پھر بھی وارڈن نے نہ جانے کیوں وقت سے قبل سیٹی بجانی شروع کر دی، جس سے ان میں بڑی خفگی پیدا ہو گئی۔ ان میں سے بعض نے وارڈن سے احتجاج بھی کیا جس کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ بدستور سیٹی بجاتا رہا۔ والی بال بند کر دیا گیا، تاش اور شطرنج کی محفلیں بکھر گئیں چہل قدمی رک گئی اور وہ سب سر جھکائے خاموشی کے ساتھ بیرک میں داخل ہونے لگے۔ بالآخر سارے لوگ بیرک میں بند ہو گئے۔ وارڈن نے بیرک کے آہنی دروازے میں قفل لگانے کے بعد اسے تین دفعہ جھٹک کر دیکھا کہ قفل ٹھیک سے بند ہے یا نہیں۔ پھر وہ اوپر کی جیب میں کنجیوں کا گچھا رکھ کر بیڑی کے کش لگاتا ہوا روانہ ہو گیا۔

دروازہ بند ہوتے ہی رات کے کھانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کھانے کا سارا سامان پہلے ہی بیرک میں پہنچ چکا تھا، چنانچہ چٹائیاں بچھا دی گئیں اور دس دس افراد دو قطاروں میں کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ بڑودا[1]

---

[1] بڑودا۔ بنگلہ میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں۔

کھانے کی تقسیم کی نگرانی کرنے لگے جو کچن کے انچارج تھے اور جیل کے قواعد وضوابط سے واقف ہونے کے باعث حکّام سے کھانے پینے کا سامان ایک ساتھ وصول کر لیتے تھے اور سزا یافتہ قیدیوں کی مدد سے کھانے پکواتے تھے۔ انگریزوں کے دور سے لے کر اب تک ان کی نصف زندگی قید میں گزر چکی تھی۔ اس لیے جیل کا کوئی ایسا قانون نہیں تھا جو انھیں ازبر نہیں تھا۔

فرش پر بیٹھنے میں دقّت ہونے کے باعث اس کا کھانا اس کی پلنگ پر آجاتا تھا۔

مونی سانیال اس کا کھانا لے کر آیا تو اس نے بھوک نہ ہونے کا بہانہ کر کے واپس کر دیا۔ مونی پہلے تو اسے تعجب سے دیکھتا رہا اور ایک دو بار کھانا کھانے کے لیے اصرار بھی کیا لیکن وہ جب تھالی رکھنے کے لیے آمادہ نہ ہوا تو وہ واپس چلا گیا اور اس نے بڑودا کو اس کی اطلاع کر دی۔

آج وہ اپنے آپ میں گم رہنا چاہتا تھا۔ صرف سوچنا چاہتا تھا۔ ماضی کی باتیں۔ حال کے واقعات اور مستقبل کے اندیشوں کے بارے میں۔

جیل میں یہ اُس کی آخری رات تھی۔ کل وہ رہا کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد۔۔۔۔؟

وہ تکیے کے نیچے سے پریتی کی لکھی ہوئی چٹھّیاں نکال کر پڑھنے لگا۔ یہ چٹھّیاں اسے بہت عزیز تھیں۔ اس نے انھیں سیکڑوں بار پڑھا تھا۔ اِس کا ایک ایک جملہ اسے یاد ہو چکا تھا۔ پھر بھی جب کبھی اس کا دل افسردہ ہوتا یا دل گھبرانے لگتا تو وہ یہ چٹھّیاں نکال کر بیٹھ جاتا اور وہ اس طرح چند لمحوں کے لیے ماضی میں کھو جاتا۔ پریتی اس کے پڑوسی رہیس سرکار کی لڑکی اور اس کے بچپن کی دوست تھی اور اس کے ذریعے ہی اس کی ماں کی خیریت معلوم ہوتی تھی۔ ان دونوں میں خوب بنتی تھی۔ دونوں جب چھوٹے تھے تو آپس میں خوب کھیلا کرتے تھے۔ گاؤں کی مسجد میں قرآن اور شستو شکھا پڑھنے کے بعد جو بھی وقت بچتا وہ دونوں آم کے پیڑوں پر چڑھ کر کچّے پکّے آم توڑنے، پرندوں کے گھونسلوں سے انڈے اور بچّے نکالنے یا برساتی نالوں میں بام مچھلیاں پکڑنے میں صرف کرتے تھے۔ ہر کام میں وہ اس کے ساتھ رہتی اور جب شام ہو جاتی تو وہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔ پھر دونوں بڑے ہو گئے۔ پریتی میں شعور کے ساتھ ساتھ شرم وحیا کا احساس پیدا ہو گیا اور وہ لیے دیے رہنے لگی۔ اس کا سارا اچنچل پن ایک دم غائب ہو گیا اور اس میں سنجیدگی آگئی جو شباب میں قدم رکھتے ہی عموماً لڑکیوں میں آجاتی ہے، پھر بھی وہ جب اس کے سامنے آتا تو وہ مسکرا کر اس کا استقبال کرتی، اس کی نگاہیں خود بخود جھک جاتیں

اور وہ اپنے بڑھتے ہوئے جسم کو آنچل کے ذریعے اس کی دُزدیدہ نگاہوں سے چھپانے میں مصروف ہو جاتی۔

وہ بڑا ہو کر اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں میں جانے لگا۔ اس کا باپ جوت دار پرتاب الدین کی زمین پر کام کرتا تھا اور فصل کی کٹائی پر اسے اس کا نصف حصّہ مل جاتا تھا۔ وہ بھی اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ پھر ایک روز اس کے باپ کو بخار آیا تو وہ پھر بستر سے اُٹھ نہ سکا۔ وہ گاؤں کے وید سے اس کے لیے دوا لے آیا، لیکن تین دنوں کے اندر اس کا باپ چل بسا۔ اب دنیا میں اس کی صرف بوڑھی ماں رہ گئی تھی۔ وہ جوت دار کی زمین پر اپنے باپ کی جگہ کام کرنے لگا، لیکن اب وقت بدل چکا تھا۔ ہر گاؤں میں کسان سبھائیں بن چکی تھیں۔ کسانوں میں خود آگہی پیدا ہو چکی تھی اور ہر کسان کا مطالبہ تھا کہ اسے بٹائی کے نصف کے بجائے ایک تہائی حصّہ دیا جائے، جس پر جوت دار آمادہ نہیں تھا۔ وہ اس تحریک میں پیش پیش تھا، چنانچہ جس بات کا اندیشہ تھا، بالآخر وہی ہوا۔ فصل کی تقسیم کے وقت کسانوں اور جوت دار کے گماشتوں کے درمیان تصادم ہو گیا۔ کئی افراد زخمی ہوئے اور معاملہ تھانے اور عدالت تک پہنچا اور دوسرے کسانوں کے ساتھ وہ بھی گرفتار کر لیا گیا۔ چند پیشیوں کے بعد مقدمہ خارج ہو گیا لیکن تیبھاگا تحریک کا خطرناک کارکن ہونے کے باعث اُسے غیر معینہ مدّت کے لیے آہنی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔

اس کے بعد بھی اس کے نام پریپریتی کی چٹھّیاں آتی رہیں، جن سے اس کی ماں کی خیریت معلوم ہوتی رہی۔ وہ مہینہ میں ایک بار اپنی ماں کو خط لکھتا تو اس کا جواب پریتی ہی دیتی، اس لیے کہ اس کے سوا دوسرا کوئی چٹھّی کا جواب دینے والا نہیں تھا۔

یہاں آنے کے بعد اس کی دنیا ہی بدل گئی۔

دوسرے نظر بندوں کی طرح اسے بھی بیرک میں رکھا گیا، جہاں اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ ہر شخص نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، بہت ہی محبّت اور خلوص کا ثبوت دیا اور اس کا حوصلہ بڑھایا، جس سے وہ بہت متاثر ہوا۔ اس طرح وہ وہاں خوش اور مطمئن رہنے لگا۔ وہاں ہر قسم کے لوگ موجود تھے ڈاکٹر، وکیل، بیرسٹر، پروفیسر، اسکول ٹیچر، کسان اور ٹریڈ یونین رہنما اور سیاسی کارکن۔ اَن پڑھ اور کم پڑھے لکھے ساتھیوں کے لیے پہلے ہی تعلیمی کلاس جاری تھی، چنانچہ تیسرے ہی روز اسے کاغذ،

پینسل اور کتاب دے کر پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ وہ پھر سیاسی کلاس میں شریک ہونے لگا، جو سینئر سیاسی رہنما لیا کرتے تھے۔ اُس میں اس طرح حصولِ علم کا شوق پیدا ہوا اور وہ نہایت تیزی سے تعلیمی مراحل طے کرنے لگا اور اس نے وہاں سے میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دیا۔ اس دوران اُسے رہ رہ کر اپنی بیوہ اور ضعیف ماں کا خیال آتا اور وہ تھوڑی دیر کے لیے اداس ہو جاتا۔ نظر بندی تعلیم کی وجہ سے اس کی فکر میں پختگی پیدا ہو گئی، اس کا مزید حوصلہ بلند ہو گیا اور اس نے باؤنڈ پر رہا ہونے سے انکار کر دیا۔ پھر ایک دن وہ سانحہ پیش آیا جس نے اس کی زندگی تلخ کر دی اور وہ ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو گیا۔

بات صرف اتنی تھی کہ انگریز سپرنٹنڈنٹ انھیں، اخلاقی مجرموں کی طرح روز لائن حاضر ہونے کا حکم دیتا تھا، جو ان کے لیے نہایت ہتک آمیز تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معزز نظر بند ہیں۔ ان کے ساتھ اخلاقی مجرموں جیسا سلوک کرنا مناسب نہیں ہے۔ بوڑودا نے جب سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی تو اس نے انھیں سڑی ہوئی گالی دی، جس پر ایک نوجوان ساتھی نے اُسے زوردار مُکا رسید کر دیا۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہو گیا۔ اس کے بعد پھر کیا تھا۔ تمام وارڈن ان پر ٹوٹ پڑے اور لاٹھیاں برسنی شروع ہو گئیں۔ انھوں نے اپنے دفاع کے لیے بیرک میں پناہ لی اور بیرک کو اندر سے بند کر لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جیل کی پاگل گھنٹی بج اٹھی۔ رائفلوں سے مسلح وارڈن دوڑ پڑے اور بیرک کے اندر فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے بعد کیا ہوا، کسی کو نہیں معلوم ہوا۔ ٹیئر گیس اور فائرنگ سے تمام لوگ بیہوش اور زخمی ہو گئے۔

اس واقعے کو کتنا عرصہ گزر گیا لیکن اس سانحے نے اس کی زندگی کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ اب وہ اپاہج تھا اور اپنی آزادی کا منتظر!

بوڑودا نے نہایت خاموشی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ اُن کا لمس محسوس کر کے چونک پڑا۔

"کیا بات ہے نور؟ تم نے آج کھانا نہیں کھایا؟"

"بھوک نہیں ہے بوڑودا!" اس نے پھر بہانہ کیا۔

بوڑودا کی تجربہ کار نگاہوں نے اس کے دل کی کیفیت بھانپ لی اور وہ اس کے چہرے کو

پڑھنے لگے۔ اس کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت عیاں تھی۔ انھوں نے ہمدردی سے کہا "تم کل رہا ہو رہے ہو، کیا اسی لیے اُداس ہو؟ لوگ تو رہائی کی خبر سُن کر خوش ہوتے ہیں اور تم اُداس ہو رہے ہو۔"

انھوں نے پیار بھرے لہجے میں اس طرح کہا کہ وہ پھٹ پڑا۔ اُس سے ضبط کا دامن چھُٹ گیا اور اس نے ایک معصوم بچّے کی طرح ان کے شانے سے لگ کر کہا "میرا سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ میں کہاں جاؤں؟"

(۸ر نومبر ۸۵ء)

آنکھوں کے سمندر نہیں روتے

"آج جب کہ میں ۱۷ برس کا ہو چکا ہوں، مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ میرا باپ کون ہے؟ اس کا نام کیا تھا، اور وہ کہاں رہتا تھا؟ میرے دیگر رشتہ دار کہاں ہیں؟ میں گزشتہ پچاس سال سے اُن کی تلاش میں ہوں۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود مجھے آج تک کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔"

اس نے لکھتے لکھتے اپنی ڈائری ادھوری چھوڑ دی اور بستر پر چت لیٹ گیا۔ وہ بہت ضعیف ہو چکا تھا اور ساتھ ہی نحیف بھی۔ وہ مسلسل بیمار رہنے کے باعث چلنے پھرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ خادمہ اس کی خدمت کرتی، اس کی ضرورت پوری کرتی، اور وہ بستر پر لیٹا رہتا اور سونے اور جاگنے کی درمیانی کیفیت میں وقت کاٹتا رہتا۔ اُسے یقین تھا کہ اب وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہے گا، اس لیے وہ اپنی تلاش جلد از جلد مکمل کر لینا چاہتا تھا، لیکن وہ انھیں کس طرح تلاش کرے؟ اس نے اپنی سی ہر کوشش کر لی تھی، لیکن کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ کیا معلوم کب آنکھیں بند ہو جائیں اور وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز سینے میں چھپائے دنیا سے رخصت ہو جائے۔ یہ سب کچھ کس طرح معلوم ہو، کس طرح؟

اس نے اپنی ڈائری اٹھائی اور ورق گردانی شروع کر دی۔ ایک جگہ اس کی نظر رک گئی۔

"وہ کون تھا جو میری تعلیم اور پرورش کے لیے اخراجات برداشت کرتا رہا۔ اس کے ساتھ میرا کیا رشتہ؟"

اس نے ڈائری بند کر دی اور سوچ میں ڈوب گیا۔

وہ جب بچّہ تھا تو اسے ایک عرصے تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا کوئی ماں باپ بھی ہے۔ وہ عام بچّوں کی طرح یتیم خانے میں پرورش پاتا رہا، البتہ دوسرے بچّوں کی بہ نسبت اس کے ساتھ نرم اور ہمدردانہ سلوک کیا جاتا اور اسے اچّھا کھانا اور اچّھا کپڑا ملتا۔ اس امتیاز کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس نے کبھی اپنے اور عام بچّوں کے درمیان فرق پر غور نہیں کیا۔ اس میں اس پر غور کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ پھر نہ جانے وہ کب یتیم خانے سے بچّوں کے اقامتی اسکول میں منتقل کر دیا گیا اُسے معلوم ہی نہ ہو سکا۔ بس ایک عورت آئی اور اُسے اپنے ساتھ لے کر چلی گئی اور وہ بالکل نئے ماحول میں پہنچ گیا۔ دوسرے بچّوں کی بہ نسبت اس کی یادداشت قدرے تیز تھی۔ اسے بہت جلد سبق یاد ہو جاتا تھا، جس کے باعث اسے تمام ٹیچر پیار کرتے تھے۔ ایک عورت ہر ماہ اس سے ملنے کے لیے آتی اور اسے ایک دن کے لیے اپنے ساتھ لے جاتی۔ اُسے جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ اُس نے اس کے ساتھ کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا، جس پر اس کے باپ ہونے کا گمان ہوتا۔ وہ ہمیشہ تنہا آتی اور اس کے ساتھ تنہا رہتی، وہ بہت خوب صورت اور جوان تھی، جیسے کسی ملک کی شہزادی۔ وہ اسے جب تک اپنے پاس رکھتی، خوب پیار کرتی، کھانے کے لیے اچّھی اچّھی چیزیں دیتی، ہمیشہ سینے سے لگائے رکھتی اور بات بات پر اسے چومتی رہتی۔ وہ اس کے ساتھ خوب کھیلتی، خوب ہنستی اور قہقہے لگاتی۔ کبھی گانے لگتی اور اسے لوری سنا کر سلانے کی کوشش کرتی اور اس کی معصومانہ حرکتوں سے خوب خوش ہوتی، لیکن اس کا پیار و محبت صرف ایک دن کے لیے ہوتا۔ صرف اس دن کے لیے، جب وہ اسے ہوسٹل سے اپنے ساتھ لے کر آتی اور دوسرے روز واپس پہنچانے کے بعد اس طرح غائب ہو جاتی، جیسے اس کا اس سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ وہ جب اسے ہوسٹل واپس پہنچاتی تو روتی رہتی اور سسٹر کے حوالے کرنے کے بعد بھی وہ اسے جاتے وقت مُڑ مُڑ کر دیکھتی رہتی اور ہاتھ ہلا ہلا کر ٹاٹا کرتی رہتی۔ اُس نے اس سے رخصت کے وقت کئی بار پوچھا بھی کہ وہ کیوں روتی ہے، اور اسے چھوڑ کر کیوں چلی جاتی ہے۔ وہ اسے اپنے پاس کیوں نہیں رکھتی؟ لیکن اُس نے اس کے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دیا اور بس ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو آتی رہی۔

وہ جب چھ سال کا ہو گیا تو وہ ایک روز اسے اپنے ساتھ گھر لے آئی اور اُسے اپنے پاس

رکھ لیا۔ اس کا بہت بڑا گھر تھا، جیسے کوئی محل۔ گھر میں نوکر چاکر سب کچھ تھا، لیکن اس کی ماں کے سوا وہاں اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ وہ دن بھر باغ میں تنہا یا اپنی ماں کے ساتھ کھیلتا رہتا اور جب تھک ہار جاتا تو نرم اور آرام دہ بستر پر سو جاتا۔ وہ کئی دنوں تک اپنی ماں کے ساتھ رہا۔ پھر ایک روز وہ اسے لے کر بہت لمبے سفر پر روانہ ہو گئی۔ اسے اب بھی یاد ہے۔ ریل بہت دیر تک چلتی رہی۔ وہ اس دوران کئی بار سویا اور کئی بار جاگا، لیکن ریل چلتی رہی۔ پھر وہ ایک سنسان سے اسٹیشن پر اتر گئے اور موٹر پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ موٹر اونچی نیچی اور ٹیڑھی میڑھی پہاڑی سڑکوں سے گزرتی رہی۔ ایک طرف پہاڑی ٹیلوں پر دیودار کے اونچے اونچے درخت تھے اور دوسری جانب بہت گہری کھائی اور دور بہت دور پہاڑ کی برف پوش چوٹیاں تھیں۔ پھر گاڑی ایک اونچی پہاڑی پر ایک بہت ہی خوبصورت عمارت کے سامنے ٹھہر گئی جس کے سامنے بہت بڑا میدان تھا۔ ہر جانب لال پیلے پھول کھلے ہوئے تھے اور بچے شوخ رنگ کے کپڑوں میں ملبوس فٹ بال کھیلنے میں مصروف تھے۔ اس کی ماں اسے لے کر ایک خوبصورت سی عمارت کے اندر داخل ہو گئی اور اسے ایک ضعیف عورت کے حوالے کرتے ہوئے کہا "اب تم یہیں رہو گے۔ میں ہمیشہ کی طرح تم سے ملنے کے لیے آتی رہوں گی۔"

پھر اس نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور بہت دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ وہ بھی اس کے ساتھ روتا رہا اور اپنی ننھی منی انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھتا رہا۔

وہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو اس کا انتظار کرتا۔ کالجیٹ اسکول کے بڑے سے احاطے میں اونچے اونچے آہنی سلاخوں والے دروازے کے پیچھے آ کر وہ اس کے انتظار میں کھڑا رہتا۔ اُسے بھوک پیاس اور گرمی سردی کسی کا بھی احساس نہ رہتا۔ اسکول کا چوکیدار اُسے اندر جانے کے لیے کہتا، سسٹر اسے پکڑ کر اندر لے جاتی لیکن وہ موقع پا کر پھر صدر دروازے پر آ کر کھڑا ہو جاتا اور خاموشی سے راستہ تکتا رہتا اور اس طرح صبح سے شام ہو جاتی۔ اس کی ماں نے اس سے جو وعدہ کیا تھا، اس نے اُسے پورا نہیں کیا اور وہ اس دن کے بعد اس سے ملنے کے لیے پھر کبھی نہیں آئی۔

اس طرح کئی سال گزر گئے۔

اسے ایک عرصے تک یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اس کے اسکول کی فیس کون ادا کرتا ہے اور کہاں سے آتا ہے۔ اسکول کے اسٹاف نے اس سے اس بارے میں کبھی بات نہیں کی اور نہ اسے اس کی ضرورت

پیش آتی۔ ہر سال کی پہلی تاریخ کو اس کے سال بھر کی فیس اور دیگر اخراجات کے لیے رقم اسکول کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتی اور اسے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہوتا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ امیر زادوں کا اسکول ہے اور اس میں صرف بڑے اور اعلیٰ طبقے کے بہت مالدار لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ اسے جب اس بارے میں تفتیش کرنے کا خیال آیا تو وقت بہت گزر چکا تھا اور وہ کافی بڑا ہو چکا تھا۔ وہ اسکول کے بہترین طالب علم کی حیثیت سے کیڈٹ کور کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ اس کے بعد اسے اس بارے میں غور کرنے اور اپنا تجسس دور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ اتنی سخت ڈسپلن میں تعلیم حاصل کرنے لگا کہ اسے اس بارے میں غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ کیڈٹ کالج میں صبح سے شام، بلکہ رات تک کے ایک ایک لمحے کے لیے روٹین مقرر تھا اور اس سے مفر ممکن نہ تھا۔ صبح سویرے اُٹھنے اور غسل اور ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میدان میں پی ٹی کے لیے جمع ہو جانا ضروری تھا۔ پینتالیس منٹ کی پی ٹی اور دیگر ورزشوں کے بعد آٹھ بجے صبح اسمبلی ہوتی اور تمام طلبا کلاسوں میں پہنچ جاتے، جہاں ایک بجے تک پڑھائی جاری رہتی۔ اس کے بعد کھانے کا وقفہ ہو جاتا۔ تمام طلبا میس میں جمع ہو جاتے اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آرام کرنے کی غرض سے اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے۔ شام چار بجے سارے لڑکے کھیلنے کے لیے کلب یا فٹ بال گراؤنڈ پہنچ جاتے اور شام تک کھیل کود میں مصروف رہتے۔ جب کھیل کود کر واپس آتے تو پھر چالیس منٹ کی اسٹیڈی میں مصروف ہو جاتے۔ اس کے بعد رات کے کھانے کا وقت ہو جاتا اور رات کا کھانا کھانے کے بعد پھر اسٹیڈی کے لیے کمروں میں چلا جانا پڑتا اور رات نو بجے سیٹی بجتے ہی بتیاں گل کر کے سو جانا پڑتا۔ اتنے سخت ڈسپلن میں رہنے کے باعث اس کے ذہن میں ماں کا خیال عارضی طور پر محو ہو گیا اور اس کی ساری توجہ پڑھائی کی جانب مبذول ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایک کیڈٹ کے طور پر کامیاب رہا اور امتحان کا نتیجہ نکلتے ہی اسے آرمی میں کمیشن مل گیا اور وہ لفٹیننٹ بنا دیا گیا، کبھی کبھی رات کو سونے سے قبل اس کے ذہن میں اس بارے میں خیال آتا بھی تو دوسرے خیالات کے تلے دب جاتا اور اس طرح وقت گزرتا رہا اور وہ اس بارے میں اس وقت تک کچھ نہ جان سکا جب تک کہ وہ کیپٹن کے عہدے پر فائز نہ ہو گیا۔

وہ ایک روز کیپٹن کے فل ڈریس میں اپنے اسکول میں پہنچ گیا۔ سب سے پہلے وہ پرنسپل سے ملا اور اپنا تعارف کرایا۔ مسز واڈیا کی جگہ مسز بروچہ اسکول کی پرنسپل تھیں۔ مسز واڈیا کا بہت دن

قبل انتقال ہو چکا تھا۔ انھوں نے اسے شناخت کرنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ اس نے بتایا کہ وہ اسی اسکول کا طالب علم ہے اور اس نے یہیں اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی ہے۔ وہ اسکول کے پرانے رجسٹر سے اپنے ماں باپ کا نام اور پتہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ کون تھے اور کہاں رہتے تھے۔ مسز بروچہ فوراً تہہ تک پہنچ گئیں۔ تجربہ کار نگاہوں نے سب کچھ سمجھ لیا۔ انھوں نے اسے غور سے دیکھا اور سوچ کر کہا: "آپ بیس پچیس سال قبل کی باتیں کر رہے ہیں۔ بیس پچیس سال قبل کا ریکارڈ ملنا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی میں تلاش کرنے میں آپ کی مدد کروں گی۔ آپ ہمارے ہیڈ کلرک سے مل لیں۔ وہ شاید آپ کی کچھ مدد کر سکیں۔"

مسز بروچہ نے اسے چپراسی کے ساتھ ہیڈ کلرک کے پاس بھیج دیا۔ بیس سال کے دوران دنیا بدل چکی تھی۔ اسکول کی صورت بدلنے کے ساتھ ساتھ تمام اسٹاف اور ٹیچرز بھی بدل چکے تھے۔ اب وہاں اس کا کوئی شناسا نہیں رہا تھا۔ ہیڈ کلرک بھی بدل چکا تھا۔ اس نے اس سے اپنا مدعا کھل کر بیان کیا اور اسے یہ کام انجام دینے پر انعام کا لالچ بھی دیا۔ اس نے تمام واقعہ سن کر کہا، "آپ چوں کہ اس اسکول کے پرانے طالب علم ہیں، اس لیے میں آپ کی حتی المقدور مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔ آپ ایک ہفتے کے بعد تشریف لائیے۔ شاید بیس سال پرانے ریکارڈ سے نام اور پتہ مل جائے۔"

ایک ہفتے کے بعد وہ جب اسکول پہنچا تو ہیڈ کلرک نے اسے ایک کاغذ تھما دیا۔

مسز ایس۔ حسین۔۔ ۲۰۰ آکسفرڈ اسٹریٹ، لندن۔ ڈبلیو۲

ہیڈ کلرک نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ اس درس گاہ میں آنے سے قبل سینٹ میری اور فینج میں زیر تعلیم تھا۔ اسے جب اسکول میں داخل کیا گیا اس وقت اس کی چھ سال عمر تھی۔ رجسٹر میں سرپرست کے خانے میں صرف اس کی والدہ کا نام شہناز حسین درج ہے۔ باپ کے نام کا خانہ خالی ہے۔ ہیڈ کلرک نے ایک علیحدہ کاغذ میں یتیم خانے کا نام اور پتہ درج کرتے ہوئے کہا "اگر آپ وہاں مزید معلوم کر لیں تو بہتر ہے۔ شاید اس طرح کوئی سراغ مل جائے۔" اس نے یہ بھی بتایا کہ اسکول کے ریکارڈ سے معلوم ہوا کہ مسز حسین ہر سال ایک بڑی رقم اسکول کے نام ڈرافٹ کے ذریعے بھیج دیتی تھیں جو اس کی فیس اور دیگر اخراجات کے لیے کافی ہوتی تھی۔

وہ رقعہ لے کر بھاری قدموں سے اسکول کے احاطے سے باہر نکل آیا

وہ اور فینچ بھی گیا اور اس کے سربراہ فادر اینڈرو ز سے بھی ملا۔ انھیں تمام باتیں بتائیں۔ وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے، پھر بھی فادر نے اسے اور اس کی ماں کو فوراً پہچان لیا۔ وہ اس سے بہت محبت اور خلوص سے ملے اور اس کی ماں کی تعریفیں کرتے رہے "وہ صحیح معنوں میں بہت شریف، نیک اور اعلیٰ خاندان کی خاتون تھی۔ بہت ہی خوب صورت اور نازک اندام۔ وہ مہینہ میں صرف ایک بار تم سے ملنے کے لیے آتی تھی اور تمھیں ایک دن کے لیے ساتھ لے جاتی تھی۔ پھر دوسرے روز پہنچا جاتی تھی لیکن افسوس میرے پاس اس کا کوئی ریکارڈ یا پتہ نہیں ہے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ اس نے کبھی تمھارے باپ کا نام نہیں بتایا۔"

اس کے بعد کتنے دن اور کتنی راتیں اور کتنے ماہ و سال گزر گئے، اُسے یاد نہیں رہا، لیکن اس نے اس رقعے کو مقدس امانت کی طرح محفوظ رکھا اور اپنی ڈائری میں اس کے نام اور پتے کو نقل کر لیا۔ مبادا کہیں یہ رقعہ گم نہ ہو جائے اور اس طرح وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز معلوم کرنے سے محروم رہ جائے۔ پتہ مل جانے کے باوجود وہ نہ تو اپنی ماں کو خط لکھ سکتا تھا اور نہ خود ہی جا سکتا تھا۔ جنگِ عظیم عروج پر تھی اور جرمن طیارے لندن پر دن رات بمباری کر رہے تھے، اور برِّصغیر سے لندن کا ہر قسم کا مواصلاتی رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس دوران اسے برما کے محاذِ جنگ پر جانا پڑا، جہاں وہ برطانوی فوج کے ساتھ جاپانیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا، جنگی قیدی کی حیثیت سے صعوبتیں جھیلیں، لیکن اس نے ہر حال میں اپنے وجود کو برقرار رکھا تاکہ وہ یہ راز معلوم کر سکے۔
وہ دن کے وقت ہجوم کے ساتھ رہتا تو سب کچھ بھول جاتا، لیکن رات کے سناٹے میں جب تنہا ہوتا تو شعور کے کسی تاریک گوشے سے پھر یہ خیال اُبھر آتا اور اسے سانپ کی طرح ڈستا رہتا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ یہ احساس شدت اختیار کرتا گیا اور بالآخر جنون کی سطح تک پہنچ گیا۔

جنگ ختم ہوتے کے چند دنوں کے اندر جنگی قیدی رہا کر دیئے گئے۔ وہ بھی ملایا سے ہندوستان واپس آ گیا اور اسے میجر کے عہدے پر ترقی دینے کے بعد سرگرم فوجی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا اور بمبئی اور لندن کے درمیان مسافت کا سلسلہ بحال ہوتے ہی وہ پہلے جہاز سے لندن روانہ ہو گیا۔ ایسے دور میں جبکہ برطانیہ میں پھنسے ہوئے ہندوستانی کئی برسوں کے بعد ہندوستان لوٹ رہے تھے۔ وہ واحد

ہندوستانی تھا جو لندن جا رہا تھا۔ اس نے لندن پہنچ کر ۲۰ اوکسفرڈ اسٹریٹ کا کھوج لگایا تو وہاں سوائے ملبوں کے اور کچھ نہ پایا۔ دوسری عمارتوں کی طرح اس عمارت کا بھی کوئی نام و نشان نہ تھا۔ اس نے ریڈکراس سے رجوع کیا۔ اخبارات میں تلاش گمشدہ کے کالموں میں کئی مہینے اشتہارات چھپوائے، گم شدہ لوگوں کا سراغ لگانے والے مختلف دفتروں کی خاک چھانی۔ پھر بھی کوئی سراغ نہیں ملا اور وہ کئی ماہ کے انتظار کے بعد مایوس اور دل شکستہ ہندوستان واپس آگیا۔

اس کے پاس سب کچھ تھا۔ ذاتی بنگلہ، کار، بینک بیلنس، کاروبار میں حصص اور دوست و احباب سب کچھ، لیکن نہ تھا تو صرف سکونِ قلب۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد اس میں تبدیلی رونما ہوئی وہ یہ ہے کہ وہ بے تحاشہ شراب پینے لگا۔ برٹش آرمی میں رہتے ہوئے وہ شراب کو کفر نہیں سمجھتا تھا گاہے گاہے مئے نوشی بھی کر لیتا تھا اس لیے کہ یہ آدابِ محفل کا حصّہ تھا، لیکن لندن سے آنے کے بعد اس نے خود کو شراب میں غرق کر دیا اور اتنا پینے لگا کہ اس کے دوست احباب کو اسے کلب سے اٹھا کر گھر پہنچانا پڑا اور پھر یہ اس کا معمول بن گیا۔ اس کے دوستوں کو حیرت تھی کہ اس میں یہ تبدیلی کیسے آئی۔ پہلے تو وہ مئے نوشی میں بہت احتیاط برتتا تھا اور ایک حد سے آگے نہیں بڑھتا تھا اب اسے کیا ہو گیا ہے؟ وہ کون سا ایسا دکھ ہے، جسے وہ شراب میں غرق کر دینا چاہتا ہے۔ بہ ظاہر وہ ہشّاش بشّاش اور خوش و خرّم نظر آتا تھا اور دُکھ اور پریشانی کا سایہ اس کے چہرے سے عیاں نہیں ہوتا تھا۔ پھر یہ اچانک سب کچھ کس طرح بدل گیا۔ اس کی بلا نوشی کا سراغ کسی کو بھی نہیں ملا۔

جم خانہ میں ایسی مہ وشوں کا بھی جمگھٹا لگا رہتا تھا، جو اس کے قریب آنے، اس سے دوستی کرنے اور اس کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے ہمیشہ بے قرار رہتی تھیں۔ ان میں شادی شدہ بھی تھیں اور غیر شادی شدہ بھی، لیکن وہ انھیں زیادہ منھ نہیں لگاتا اور دور ہی دور سے سلام دعا کر کے رخصت کر دیتا۔ جم خانہ کے پریذیڈنٹ اور انڈسٹریل میگنیٹ رحمان رنگون والا کی اہلیہ خورشید جبیں اور ان کی نوجوان سالی مہ جبیں اس پر خاص طور پر مہربان تھیں اور بے تکلّف بھی۔ دونوں اس کی قربت کے لیے بے قرار رہتیں اور دونوں بہنوں میں اس کی زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول کرنے کا مقابلہ جاری رہتا۔ دونوں بے پناہ حسین تھیں اور جوان بھی، لیکن وہ ان سے ہمیشہ دور رہتا۔ ایک روز خورشید اسے نیم بیہوشی کے عالم میں اپنے ساتھ کلب سے باہر لانے اور اپنی کار

میں زبردستی بٹھا کر اپنے بنگلے میں لانے میں کامیاب ہو گئی۔ رحمان رنگون والا، مہ جبیں اور دوسرے دوستوں کے ساتھ اس وقت برج کھیلنے میں مصروف تھے اور انھیں معلوم بھی نہیں ہوا کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔

وہ تھوڑا تھوڑا ہوش میں تھا اور اسے اس کا احساس تھا کہ خورشید اسے اپنے ساتھ لے جا رہی ہے، لیکن کہاں لے جا رہی ہے اور کیوں لے جا رہی ہے، اسے یہ معلوم نہ تھا۔ اس میں اس کی مزاحمت کرنے کی سکت بھی نہ تھی، چنانچہ وہ ایک بچے کی طرح اس کے ساتھ روانہ ہو گیا تھا۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ خورشید نے اسے اپنے پلنگ پر لٹا دیا تھا۔ اس کے جوتے اتار دیئے تھے، ٹائی ڈھیلی کرنے کے بعد اس کی قمیص کے بٹن کھول دیئے تھے۔ اس نے اس کی خفیف سی مزاحمت کی کوئی پروا نہیں کی تھی اور اس کے سامنے اپنا ایک ایک کر کے سارا لباس اتارنا شروع کر دیا تھا۔ اُسے یاد ہے عین اس وقت کمرے میں مہ جبیں کی آواز گونج اٹھی تھی "آپا!"

اس کے بعد اسے نہیں معلوم کیا ہوا۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس نے خود کو اپنے بستر پر پایا۔ بعد میں اسے چوکیدار سے معلوم ہوا کہ کافی رات گئے اسے دو خواتین گھر پر چھوڑ گئی تھیں۔ اس کے بعد وہ خورشید اور مہ جبیں سے ہمیشہ دور رہا۔ ایک نارمل اور خوبرو انسان ہونے کے باوجود ایک احساسِ عدم تھا جو اسے ہمیشہ ان سے دور رہنے پر مجبور کرتا اور اس طرح وہ عمر کے اکہترویں سال میں پہنچ گیا اور اسے اپنی شناخت معلوم نہ ہو سکی۔

اس نے کروٹ بدلتے ہوئے دل ہی دل میں اللہ سے دعا کی۔

"یا اللہ، مجھے اس اذیت سے نجات دلا۔ اب یہ اذیت برداشت نہیں ہوتی۔"

(۱۸۔ اپریل ۱۹۸۶ء)

جوالا مکھی

"میری زندگی عذاب بن چکی ہے، خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

اُس کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"اُس نے ٹھیک ہی کہا ہے، میری وجہ سے اُس کی زندگی عذاب بن چکی ہے۔ مجھے اس کا ساتھ چھوڑ دینا چاہیے۔"

اس نے نغمہ کی جانب مڑ کر دیکھا، وہ اس کی جانب پیٹھ کیے ابھی تک رو رہی تھی۔

وہ اس کی ایک ایک بات پر غور کرتا رہا اور اس طرح نہ جانے کتنا وقت گزر گیا، اُسے اس کا احساس تک نہ ہوا۔ نغمہ روتے روتے نہ جانے کب سو گئی۔

وہ اپنے خیالات سے اُس وقت چونکا جب نغمہ خواب میں بڑبڑا رہی تھی۔ "مجھے چھوڑ دو، خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

"مجھے واقعی اس کا ساتھ چھوڑ دینا چاہیے۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا اور بڑے پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

بہت زیادہ رونے کی وجہ سے نغمہ تھک کر سو چکی تھی۔ اُسے اس کے لمس کا احساس نہ ہوا اور وہ نغمہ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

وہ آج بھی پہلے کی طرح حسین تھی، بالکل اسی طرح حسین اور پُرکشش، جیسا اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ پریس کلب میں اس کے دوست احمد پرویز کے شعری مجموعے کی رسمِ اجرا تھی۔ شہر کے تمام ممتاز ادیب اور دانشور مدعو تھے۔ نغمہ بھی نوجوان شاعرہ پروین کے ساتھ اس تقریب میں آئی تھی اور ڈائس کے بالکل قریب عورتوں کے انکلوژر میں پہلی صف میں بیٹھی ہوئی تھی۔

مردوں کے ہجوم میں چند عورتوں کی موجودگی یوں بھی باعثِ کشش ہوتی ہے اور اگر ان میں چند جاذب نظر صورتیں ہوں تو فطری طور پر سب کی نظریں اُن پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے شاید پریس اور ٹی وی کے فوٹو گرافر خاص طور پر خواتین کی تصویریں بنانے میں مصروف تھے، اور حاضرین کی نظریں بھی خواہ مخواہ ان کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ پروین اپنے بے مثال حسن اور شاعری کے باعث پہلے ہی کافی مشہور تھی۔ اس نے اسے بارہا مشاعروں اور ادبی نشستوں میں پڑھتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن نغمہ اس کے لیے قطعی اجنبی تھی اور لوگوں کی متجسّس نگاہیں اس کا مسلسل تعاقب کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بھی شاید کوئی شاعرہ ہے یا پھر پروین کی کزن، لیکن اس کا خیال اس وقت غلط ثابت ہوا جب تقریب کے اختتام پر قمر انصاری نے ریفرشمنٹ کے دوران اس کا پروین اور نغمہ سے تعارف کرایا۔

قمر ایک شاعر اور پروفیسر کی حیثیت سے ادبی اور تعلیمی حلقوں میں بہت مقبول تھا، اور یونیورسٹی سے وابستہ ہونے کے باعث اس کی بے شمار عقیدت مند طالبات تھیں۔ قمر کی زبانی سے پہلی بار معلوم ہوا کہ پروین کی طرح نغمہ بھی یونیورسٹی کی طالبہ ہے، لیکن ان کے مضامین مختلف ہیں۔ پروین انگریزی ادب کی طالبہ تھی، جب کہ وہ جرنلزم کی۔

تقریب کے ختم ہونے اور ہجوم کے چھٹ جانے کے بعد بھی وہ پریس کلب کے لان میں بیٹھے بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ اس کا ادب سے بھی گہرا تعلق تھا اور صحافت سے بھی۔ اس لیے وہ

بھی ان کی گفتگو میں شامل رہا۔ اسے پروین نے بتایا کہ نغمہ جرمنی کے فائنل ایئر میں ہے اور اسے عملی تربیت کے لیے چند ماہ کسی اخبار میں کام کرنا ہے، اس لیے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے اخبار میں اس کے گروپ کے لڑکے اور لڑکیوں کی تربیت کا انتظام کردے۔ اس نے اس پر فوراً آمادگی ظاہر کردی اور اس نے نغمہ کو دوسرے روز اپنے ساتھیوں کے ساتھ دفتر آنے کی دعوت دی۔

نغمہ کی پرکشش شخصیت سے وہ بہت متاثر تھا۔ اسے یہ جان کر اور بھی خوشی ہوئی کہ اسے بھی شعر و ادب سے دلچسپی ہے اور وہ بھی افسانے وغیرہ لکھتی ہے۔ نغمہ نے اسے بتایا کہ وہ رسالوں میں اس کے افسانے اور ناول پڑھتی رہتی ہے اور اُسے اس کا اسٹائل بہت پسند ہے۔ نغمہ نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ اس کی نگرانی میں اخبار نویسی کی تربیت حاصل کرکے خوشی محسوس کرے گی اس سے نغمہ کے ان الفاظ کو اپنے لیے زبردست خراج تحسین تصور کیا اور وہ کئی دنوں تک اس کے خیال میں محو رہا۔ اس کے حسن نے اس کی طرح پختہ عمر شخص کے ذہن پر جادوئی اثر کیا تھا۔ اس کی کوششوں سے اخبار کی انتظامیہ نے نغمہ اور اس کے گروپ کے دوسرے طلبا و طالبات کو نیوز ڈیسک میں بیٹھنے کی اجازت دے دی اور ان کی مدد کے لیے اسے مقرر کردیا گیا اس اثنا میں نغمہ اس سے کافی دلچسپی لینے لگی۔ ادب اور صحافت سے مشترکہ دلچسپی نے انھیں غیر ارادی طور پر بہت قریب کردیا۔ وہ دفتر سے اس کے ساتھ نکلتی اور صدر اور ایلفی میں بلا مقصد مٹرگشت کرتی رہتی اور جب تھک جاتی تو اس کے ساتھ کسی پُرسکون ریستوران میں جا بیٹھتی اور دنیا جہاں کے موضوع پر باتیں کرتی رہتی۔ نغمہ سے بے تکلفی کے باوجود وہ زیادہ آگے بڑھتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ہوسکتا ہے نغمہ کا اس سے ملنے جلنے کا مقصد صرف دوستی ہو، اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہو۔

ایک دن جب وہ ریستوران میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اس نے بے ساختہ کہا "زندگی بظاہر جتنی خوب صورت نظر آتی ہے، وہ اتنی خوب صورت نہیں ہوتی۔ زندگی کو خوب صورت بنانے کے لیے روپوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے تمہیں کسی باحیثیت شخص سے شادی کرنی چاہیے تاکہ زندگی

کی تمام آسائشیں حاصل ہو گئیں"

نغمہ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا، جیسے وہ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"کیا وہ اسے پسند کرتا ہے؟ اس نے اسے کسی باحیثیت شخص سے شادی کرنے کا مشورہ اس لیے تو نہیں دیا کہ وہ خود کو باحیثیت نہیں سمجھتا؟ لیکن کیوں؟ وہ ایسا کیوں سمجھتا ہے؟ وہ خود کو کیوں اس قابل نہیں سمجھتا؟" ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں یہ سوالات ابھرے۔

نغمہ نے ساری جھجک کو بالائے طاق رکھتے ہوئے براہِ راست سوال کیا "آپ کیوں خود کو اہل نہیں سمجھتے؟"

اس نے بڑے پیار سے نغمہ کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "اس لیے کہ میں ایک معمولی انسان ہوں۔ ایک عام ادیب اور صحافی۔ اس لیے تم میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکو گی اور بہت جلد گھبرا جاؤ گی، زندگی تلخ ہو جائے گی اور تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گی"

"آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ آپ زندگی کی ہر آزمائش میں اپنے ساتھ پائیں گے"

"نغمہ نے زندگی کے سفر میں بلاشبہ بہت دور تک ساتھ دیا ہے۔ اس نے بڑی تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ میری وجہ سے اُس پر اُس کے والدین کے گھر کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ زندگی کی جدوجہد میں تھک چکی ہو اور اب اندر سے ٹوٹ رہی ہو"

اس نے ایک بار پھر نغمہ کی جانب دیکھا۔

وہ اسی طرح بے خبر سو رہی تھی۔ اب اس نے کروٹ بدل لی تھی اور سانس کے زیر و بم سے اس کی چھاتیاں اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ نغمہ نے آج صبح صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا "اگر تم نے مجھے آزاد نہیں کیا تو میں خلع کے لیے عدالت سے رجوع کروں گی"

عمر بھر ساتھ دینے اور ہر آزمائش میں ساتھ رہنے والی نغمہ تین سال کے مختصر عرصے میں اس سے اکتا چکی تھی اور اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے بالکل تیار تھی۔ نغمہ کے ساتھ گزارے ہوئے یہ

تین سال اس کی زندگی کے حسین ترین ماہ و سال تھے۔ ابتدائی دو سال دونوں نے نہ صرف ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کی بلکہ آئندہ زندگی کے خوبصورت منصوبے بھی بنائے، نہایت حسین خواب بھی دیکھے، جن میں بچوں سے بھرا پُرا گھر، پُرمسرت زندگی اور فارغ البالی سب کچھ شامل تھا۔ نغمہ کی حوصلہ افزائی اور اس سے تحریک پاکر اس نے اس دوران کئی کتابیں لکھ ڈالیں، جن میں افسانوں کے مجموعے اور ناولوں کے علاوہ کئی سیاسی تصانیف بھی شامل تھیں۔ اخبار میں بھی اس کی ترقی ہوئی اور اسے سینئر سب ایڈیٹر سے ترقی دے کر نیوز ایڈیٹر کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ اس کی ادبی اور اخباری مصروفیات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ وہ روز شام کو دفتر جاتا اور کافی رات گئے، بلکہ بعض اوقات صبح کاذب کے وقت گھر لوٹتا۔ نغمہ اس کا انتظار کرتے کرتے تھک کر سو جاتی۔ دوپہر کے کھانے میں ان کا ساتھ ہوتا لیکن وہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پھر اپنے ادبی کاموں میں مصروف ہو جاتا۔ اس طرح شام ہو جاتی اور وہ دفتر روانہ ہو جاتا۔ اب ان کا بہت کم وقت ساتھ گزرتا۔ حد سے زیادہ مصروفیات نے اس کی ساری خواہشوں کو کچل دیا تھا۔ اب وہ نغمہ کی جانب بھی بہت کم مائل ہوتا۔

نغمہ پہلے تو خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی رہی، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اور اس کی مصروفیات بڑھتی گئیں، اس کے لیے یہ سب ناقابل برداشت ہو گیا۔ اس کے ہاں ابھی تک کوئی اولاد نہیں تھی جس سے وہ دل بہلاتی یا خود کو مصروف رکھتی۔ وہ گھر کے کام کاج سے جلد فارغ ہو جاتی اور پھر پہاڑ جیسا وقت اس سے کاٹے نہیں کٹتا۔ وہ رسالے اور کتابیں پڑھتی، ریڈیو اور ٹی وی سے دل بہلاتی لیکن جلد ہی ان سے اُکتا جاتی اور تنہائی کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جاتا جس کے باعث اس کے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو گیا۔ اور وہ تعلیم یافتہ ہو کر بھی کتابوں کو اپنا دشمن سمجھنے لگی۔ وہ دل ہی دل میں جوالا مکھی کی طرح اندر ہی اندر کھولتی رہتی لیکن اپنی محرومی کا کسی سے اظہار نہ کرپاتی۔ اس کے صبر کا پیمانہ اس وقت

چھلک پڑے، جب ایک دن ایلفی میں شاپنگ کرتے ہوئے اس کی منوّر سے ملاقات ہو گئی۔

منوّر اس کا کزن تھا اور حال ہی میں اسٹیٹس سے واپس آیا تھا۔ جہاں وہ کنسلٹینٹ انجینئر تھا۔ منوّر اور اس نے ایک ہی ساتھ گریمر اسکول سے سینئر کیمبرج پاس کیا تھا۔ اس کے بعد منور نے کالج میں سائنس اور اس نے آرٹس لیا تھا۔ منوّر جب چھوٹا سا تھا تو اس کی امّی سے کہا کرتا تھا کہ وہ بڑا ہو کر نغمہ سے شادی کرے گا۔ وہ اسے لڑکپن سے اچھی لگتی تھی اور ان میں بڑی دوستی تھی۔ دوسرے بھائی بہنوں سے نغمہ کی لڑائی ہوتی لیکن منوّر سے کبھی نہیں۔ دونوں جب بڑے ہو گئے تو منوّر بھی ریزرو رہنے لگا اور وہ بھی۔ ان میں اب بھی بے تکلّفانہ باتیں ہوتیں، لیکن ان کے درمیان حجاب قائم رہتا۔ اس دوران منوّر کے بڑے بھائی سرور نے اسے ملی تعلیم کے لیے اپنے پاس بلا لیا، جہاں وہ میکینکل انجینئر تھے۔ منوّر کے اسٹیٹس چلے جانے کا نغمہ کو بہت افسوس ہوا۔ وہ اسے اپنا ہمدرد اور دوست سمجھتی تھی۔ منوّر اسٹیٹس گیا تو بالکل وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ابتدا میں اس کے نام منوّر کے دو چار خطوط آئے، پھر یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اس دوران اس کی زندگی ہی بدل گئی۔

منوّر سے ایلفی میں اچانک مڈبھیڑ ہو جانے پر پہلے تو وہ اسے پہچان نہ پائی۔ وہ اس دوران کافی بدل چکا تھا اور چہرے پر گوشت چڑھ جانے کے باعث اسے پہچاننا مشکل ہو گیا تھا، لیکن منوّر نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا اور وہ ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ نغمہ اسے پکڑ کر اپنے گھر لے آئی اور وہ اس سے بہت دیر تک باتیں کرتی رہی۔ منوّر کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ وہ شادی کی غرض سے پاکستان آیا ہوا ہے۔ یوں تو اسٹیٹس میں لڑکیوں کی کمی نہیں ہے اور وہاں پاکستانی لڑکیاں بھی کافی ہیں، لیکن وہ پاکستانی ماحول میں پروردہ کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ منوّر نے اس سے مذاقاً کہا "اگر تمہاری شادی نہ ہو چکی ہوتی تو میں تمھیں بیاہ کے ضرور ساتھ لے جاتا"

منوّر اس سے مذاق کر رہا تھا یا واقعی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا، وہ سمجھ نہ پائی اور بے اختیار

رو پڑی، تب اسے معلوم ہوا کہ نغمہ کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہیں ہے۔ نغمہ کے بتانے سے قبل ہی منوّر پر تمام باتیں واضح ہوگئیں۔ اس نے بے اختیار اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "نغمہ میں اب بھی تم سے محبت کرتا ہوں، میں اب بھی تمھیں قبول کرنے کے لیے تیار ہوں"۔

یہ کہہ کر اس نے نغمہ کو آغوش میں لے لیا اور اس کے ہونٹوں، رخساروں، آنکھوں اور پیشانی کو بے اختیار چومنا شروع کر دیا۔ نغمہ نے خود کو اس کے حوالے کر دیا اور اس نے یکلخت انور سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔

رات کو اس کے دفتر سے واپس آتے ہی نغمہ نے صاف اور دو ٹوک لہجے میں کہا، وہ اس سے تنگ آ چکی ہے، اس نے اس سے شادی کر کے اپنی زندگی تباہ کر لی ہے۔ اب وہ اس سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔

نغمہ کا یہ اعلان اتنا غیر متوقع اور حیران کن تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے سناٹے میں آ گیا اور اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اسے اتنا گہرا صدمہ پہنچا کہ وہ چند لمحے نغمہ کو تکتا رہ گیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے سوچا "نغمہ شاید ٹھیک کہتی ہے۔ میں نے نغمہ کو خوش رکھنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں کیا"۔

وہ نغمہ کے بارے میں سوچتا رہا اور اس طرح سوچتے سوچتے کافی وقت گزر گیا۔ تب اچانک اس نے تہیہ کر لیا "مجھے نغمہ کو آزاد کر دینا چاہیے، تمام بندھنوں سے آزاد"۔

اس نے ایک بار پھر نغمہ کی جانب دیکھا، وہ ابھی تک بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اپنی میز پر آ کر بیٹھ گیا اور لکھنے لگا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمھیں خوش نہ رکھ سکا۔ ایک شوہر کی حیثیت سے مجھ پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے، میں نباہ نہ سکا، لیکن یقین جانو، میں تمھارے خیال سے غافل نہیں رہا اور ہمیشہ دل کی گہرائیوں سے تمھیں چاہا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میری وجہ سے اذیت کی زندگی بسر کرو، میں

تمھیں ہر رشتے سے آزاد کرتا ہوں۔"

دوسرے دن اس سے قبل کہ نغمہ نیند سے بیدار ہوتی، وہ اپنی بوڑھی ماں اور بہن سے ملنے لاہور روانہ ہوگیا۔ طویل مدّت کے بعد گھر آنے کی وجہ سے اس کی ماں اور بہن بہت خوش ہوئیں اور اسے مزید چند روز روک لیا۔ وہ بھی وہاں بخوشی ٹھہر گیا، تاکہ بدلے ہوئے ماحول میں اس کا دل بہل جائے۔

ایک ہفتے کے بعد وہ گھر لوٹا تو نغمہ جا چکی تھی اور دروازے میں قفل پڑا تھا۔

اس نے دوسری کنجی سے قفل کھولا۔ سارے کمرے میں چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے عرصے سے کمرے کی صفائی نہ ہوئی ہو۔ نغمہ اپنا سارا سامان لے کر جا چکی تھی۔

وہ لباس تبدیل کیے بغیر بستر پر لیٹ گیا اور نغمہ کے بارے میں سوچتے سوچتے نہ جانے کب سو گیا۔ وہ نیند سے اس وقت بیدار ہوا جب اسے دروازے پر کسی کی دستک محسوس ہوئی۔ کمرے میں بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر بتی جلائی اور اپنی کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ اس نے دروازہ کھولا اور اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔

سامنے نغمہ ہاتھ میں اٹیچی کیس لیے کھڑی تھی۔

(۱۹۷۷ء)

فسانۂ رومانِ بہار

آپ نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے، میں کوئی آوارہ لڑکی ہوں جو ہر کسی سے فلرٹ کرتی پھروں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ میری شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے"۔

صوفیہ نے خشمگیں نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ اس کے اس طرح مشتعل ہو جانے پر گھبرا گیا تھا اور ایک نامعلوم خوف سے اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے۔ صوفیہ نے رمنہ ریستوران سے اُٹھتے ہوئے کہا "چلیے، گھر پہنچنے میں دیر ہو رہی ہے"۔

صوفیہ اُن چند مسلمان بنگالی لڑکیوں میں سے تھی، جنھیں سرپرستوں نے مجبور ہو کر ملازمت کرنے کی جازت دے رکھی تھی۔ اسے یہ ملازمت اس کی وجہ سے ہی ملی تھی۔ اس کے دوست کمال نے ایک دن اس سے کہا تھا۔ عطا، تمھارے دفتر میں ایک اسٹینو ٹائپسٹ لڑکی کی گنجائش نکل

سکتی ہے، اسے ملازمت کی بڑی ضرورت ہے۔

عطا نے لڑکی کا نام سُن کر اس سے مذاقاً کہا تھا "اچھا، تو اب تم نے لڑکیوں کو ملازمت دلانے کا دھندا شروع کر دیا ہے! کیا بات ہے یار؟ کیسی ہے؟ خوب صورت ہے یا قبول صورت؟ گوری ہے یا کالی؟ شادی شدہ ہے یا کنواری؟"

اس نے ایک ساتھ کئی سوالات کر دیے، لیکن اس کے مذاق پر کمال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں کھلی۔ اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا، نہیں یار۔ وہ بہت اچھی اور شریف لڑکی ہے۔ اسے ملازمت کی بڑی ضرورت ہے، ورنہ اس کا پورا خاندان فاقے کرے گا۔ وہ میرے پڑوس میں ہی رہتی ہے۔ میرے بابا کے دوست کی بیٹی ہے۔ اس نے حال ہی میں گریجویشن کیا ہے اور ٹائپ رائٹنگ اور شارٹ ہینڈ سے بھی واقف ہے۔ اسپیڈ بری نہیں ہے۔ وہ اب جلد از جلد ملازمت کرنا چاہتی ہے۔ ایک بوڑھا باپ اور تین چھوٹے چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ اس کا باپ ایک ہومیو پیتھ تھا لیکن ضعیف العمری کی وجہ سے اس کی آنکھوں کی بینائی باقی رہی۔ اب گھر میں اس کے سوا اور کوئی نہیں جو سارے کنبے کی ذمہ داری سنبھالے۔ اس لیے وہ بہت پریشان ہے۔ گھر میں جو قابلِ فروخت چیزیں تھیں، فروخت ہو چکی ہیں اور اب فاقے کی نوبت آ گئی ہے۔ تین دنوں سے لیلی انھیں جبراً دو وقت کا کھانا پہنچا آتی ہے، ورنہ وہ لوگ تو کسی حال میں احسان لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ فخرالدین چچا میرے بابا جرے گہرے دوست تھے اور انھوں نے ہمیشہ آڑے وقتوں میں ہماری مدد کی ہے، صوفیہ مجھے بھائی کی طرح سمجھتی ہے۔ اس لیے مجھ پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں ان کے لیے کچھ کروں، لیکن میں ان کی ہمیشہ کس طرح مدد کر سکتا ہوں۔ تم تو جانتے ہی ہو میرے دفتر میں فاضل ملازمین ہونے کے پہلے چھانٹی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ایسی صورت میں میرے دفتر میں اس کے لیے گنجائش مشکل ہے۔ اگر تمھارے دفتر میں کچھ ہو سکے تو۔

"اچھی بات ہے، میں کوشش کروں گا۔ اس دوران تم یہ کام کرو، کل ہی اس کی

طرف سے ایک درخواست دے دو۔ میں سلمان صاحب سے مل کر اس کے لیے کوشش کروں گا۔"

یہ قطعی اتفاق تھا کہ اس کے دفتر کی اینگلو پاکستانی اسٹینو اسٹیلا جونس کو جرمن کونسلیٹ میں اچھی ملازمت مل گئی اور اس نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور اُس نے جب آفس سپرنٹنڈنٹ سلمان صاحب سے صوفیہ کے لیے ایم ڈی مسٹر چودھری سے ذاتی سفارش کرنے کی درخواست کی تو انھیں بڑی حیرت ہوئی، اس لیے کہ سلمان صاحب کو معلوم تھا کہ عطا کے گھر میں کوئی ایسی لڑکی نہیں، جو آفس میں ملازمت کی امیدوار ہو، لیکن وہ یہ سوچ کر کہ ہو سکتا ہے اس کی جان پہچان کی کوئی لڑکی ہو، انھوں نے مسٹر چودھری سے صوفیہ کو رکھ لینے کی سفارش کی اور مسٹر چودھری نے بھی بنگالی لڑکی سمجھ کر ان کی بات مان لی۔

صوفیہ کو جب انٹرویو لیٹر ملا اور اس نے اس کی خبر اپنے بابا کو سنائی تو خوشی کے مارے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بچے خوشی سے ناچنے لگے اور صوفیہ بھی اپنے بابا کو خوشی سے روتے ہوئے دیکھ کر رو پڑی۔ اب دُکھ اور تکلیف کے سیاہ بادل چھٹ جانے کے آثار پیدا ہو گئے تھے، شور و ہنگامہ سن کر لیلیٰ اور کمال اس کے ہاں دوڑے ہوئے آئے۔ صوفیہ نے دوڑ کر مارے خوشی کے کمال کے پاؤں کو چھو لیا اور اس کے ہاتھ میں انٹرویو لیٹر تھما دیا۔

اس کے بابا بھی ہاتھ سے در و دیوار ٹٹولتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئے اور انھوں نے کمال کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں تمھارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا، تم نے ہم لوگوں کو فاقے سے بچا لیا۔ خدا تمھیں ہمیشہ خوش و خرّم رکھے۔"

کمال بھی اس اچانک مسرّت سے گھبرا سا گیا اور اس نے انٹرویو لیٹر پڑھنے کے بعد کہا، "چاچا، صوفیہ کی ملازمت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے، یہ تو عطا کا سب کیا ہوا ہے۔ شکریے کا اصل مستحق تو عطا ہے۔"

"عطا؟ عطا کون؟" صوفیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا، یہ عطا کون صاحب ہیں؟ پہلے تو کبھی نام نہیں سُنا۔"

"عطاالرحمٰن میرے کالج کا دوست ہے۔ موتی جھیل کے ایک کمرشل فرم میں کام کرتا ہے۔ میں نے ہی اس سے صوفیہ کی ملازمت کے لیے کہا تھا۔ یہ ملازمت اسی نے دلائی ہے۔"

"ارے، تو تم نے یہ پہلے کیوں نہیں بتایا" فخرالدین چاچا نے خوشی سے بے چین ہو کر کہا" کہاں ہے عطاالرحمٰن؟ اسے تو بلاؤ، میں بھی فساد یکھوں اس فرشتۂ رحمت کو۔ کہاں رہتا ہے وہ؟ میں ذاتی طور پر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے چاچا، کل اتوار ہے۔ میں اسے اپنے ہاں دوپہر کے کھانے پر بلا لوں گا۔ آپ لوگ بھی اس سے مل لیجیے گا۔ انٹرویو تو شاید پیر کے روز ہے، کیوں؟" اس نے صوفیہ سے پوچھا اور پھر خود ہی کہنے لگا" عطا کے آجانے سے صوفیہ کو انٹرویو دینے میں آسانی ہوگی، ورنہ وہ تو اسے پہچان بھی نہ پائے گی۔"

دوسرے دن صوفیہ، اُس کے بابا اور تمام بچّے عطا سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ فخرالدین چاچا نے عطا کو جی بھر کر دعائیں دیں اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ عطا نے بھی چند منٹوں میں اپنی خوش گفتاری اور بذلہ سنجی سے سب کا دل موہ لیا۔ وہ بچّوں میں اس طرح گھل مل گیا، جیسے وہ عرصے سے اس گھر میں آتا جاتا رہا ہو۔ اس نے اپنے حسنِ اخلاق اور باتوں سے سب کو متاثر کیا، خصوصاً صوفیہ، اس کے بابا اور لیلیٰ کو، اور جب وہ رخصت ہونے لگا تو بچّوں نے اس سے دوبارہ آنے کے لیے اصرار کیا۔ صوفیہ کے بابا نے بھی اسے دوبارہ مدعو کیا اور اُسے مجبوراً ان سے وعدہ کرنا پڑا۔ اس نے صوفیہ کو بتایا کہ انٹرویو صرف رسمی ہوگا۔ بس سمجھ لیجیے کہ اپوائنٹ مینٹ ہو چکا ہے۔

عطا کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ منیجنگ ڈائرکٹر مسٹر چودھری نے چند رسمی سوالات کیے، شارٹ ہینڈ میں ڈکٹیشن دینے کے بعد اس کے ٹائپ کیے ہوئے خط کا بہ غور مطالعہ کیا اور اس کے کام سے مطمئن ہو کر اپوائنٹ مینٹ کی ہدایت دے دی۔

اس کی میز عطا اور سلمان صاحب کی میز کے درمیان تھی، جہاں اس سے قبل مس اسٹیلا بیٹھا

رنگی تھی۔ لیکن اسٹیلا اور اس میں بہت فرق تھا۔ اسٹیلا اینگلو پاکستانی ہونے کے باوجود بہت کم پاکستانی تھی لیکن صوفیہ سو فی صد بنگالن تھی اور متوسط طبقے کی عام بنگالی مسلمان لڑکیوں کی طرح سنجیدہ اور متین بھی۔ جس کی وجہ سے دفتر کے تمام لوگ پہلے دن سے اس کی عزت کرنے لگے تھے۔ اس کے بُردبار حسن اور سنجیدہ شخصیت نے دفتر کے لوگوں پر رعب طاری کر دیا تھا اور دفتر میں واحد بنگالی لڑکی ہونے کے باعث لوگ اس سے اپنائیت محسوس کرنے لگے تھے۔

وہ بہت ریزرو رہا کرتی تھی۔ وہ مسٹر چودھری کے چیمبر میں بڑی متانت کے ساتھ جاتی۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد اس کے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ دکھائی نہیں دیتی اور نہ چہرے سے کوئی تاثر ہی ظاہر ہوتا۔ لوگ نہایت اشتیاق سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے۔ شاید مسٹر چودھری نے اسے خوش کرنے کے لیے کوئی بات کہی ہو، کوئی پُرلطف مذاق کیا ہو یا شام کو ساتھ پکچر چلنے کی دعوت دی ہو، لیکن وہ جب چیمبر سے منہ لٹکائے نکلتی تو اُن کی ساری قیاس آرائیاں غلط ثابت ہو جاتیں۔ وہ دفتر میں سوائے ضروری باتوں کے بہت کم باتیں کرتیں، عطا واحد شخص تھا جس سے وہ فرصت کے لمحوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر لیتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کا ہمدرد اور محسن تھا اور وہ اس سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ صرف اس کے دفتر کا ساتھی ہی نہیں، کمال کا دوست بھی تھا اور کمال کے ناتے اس کے ہاں بھی آنا جانا تھا۔

صوفیہ کے اس قدر متین اور ریزرو رہنے کے باوجود اُس کے ساتھیوں کو اِس کا علم ہو چکا تھا کہ عطا اور صوفیہ کے مابین ایک خاص قسم کا تعلق ہے۔ وہ عام طور پر ٹیفین کی چھٹی میں ساتھ ہی نکلتے اور شام کو بھی اُن کے دفتر سے ساتھ ہی نکلنا ہوتا دفتر کے لوگوں کو یقین تھا کہ وہ جب چھٹی کے بعد روز ساتھ نکلتے ہیں تو ضرور سیر و تفریح کے لیے بھی جاتے ہوں گے۔ ان کا قیاس کسی حد تک درست تھا۔ وہ عموماً دفتر سے نکلنے کے بعد ٹرمینس تک پیدل آتے اور جناح ایونیو پہنچنے کے بعد عطا اسے جب ریستوراں میں چلئے پینے کی دعوت دیتا تو وہ اخلاقاً انکار نہ کر پاتی۔ وہ احسان مندی کے احساس سے اس قدر دبی ہوئی تھی کہ اس میں عطا کی کسی بات سے انکار کی جرأت نہ ہوتی اور پھر

اس نے اس کے بابا کی آنکھوں کے آپریشن کے لیے جس طرح آئی اسپیشلسٹ کے ہاں دوڑ دھوپ کر کے آنکھوں کے آپریشن کا انتظام کیا تھا، اس کی وجہ سے وہ اس کے خلوص سے بہت متاثر تھی۔

پانچ آدمیوں پر مشتمل خاندان پانچ سو روپے میں کسی طرح گزارا کر رہا تھا۔ گھر کے اخراجات کے علاوہ چھوٹے بھائی بہن کے اسکول کی فیس اور کپڑے، گھر کا کرایہ، بجلی کا بل، دفتر میں آنے جانے اور باہر نکلنے کے لیے سلیقے کی ساڑیاں، بلاؤز اور جوتی اور بوڑھے باپ کے علاج کے لیے مختلف قسم کی دوائیں، یہ تمام اخراجات بہ مشکل پورے ہو رہے تھے اور وہ زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح کھینچے لیے جا رہی تھی۔ عطا کی بے لوث ہمدردی نے اس کے حوصلے بلند کر دیئے تھے اور وہ زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کی صرف بہن ہی نہیں، سرپرست بھی تھی۔ وہ روز علی الصبح بستر سے اُٹھتے ہی نہا دھو کر بھائی بہنوں کے لیے جلد از جلد کھانے پکاتی اور انھیں کھلا پلا کر اسکول بھیجنے اور اپنے بابا کو کھانا کھلانے کے بعد دفتر روانہ ہو جاتی اور دفتر سے واپس آنے کے بعد پھر رات کا کھانا پکاتی اور واپسی میں بازار سے سبزیاں ترکاریاں بھی لیتی آتی۔ اس کے بعد عطا بچوں کو پڑھانے کے لیے آجاتا۔ جب سے اس کا چھوٹا بھائی انّو امتحان میں فیل ہوا تھا، عطا اسے روز رات کو پڑھانے لگا تھا۔ عطا جب تک پڑھاتا رہتا وہ سینے پرونے، سبزیاں کاٹنے یا چاول چُننے میں مصروف رہتی اور اگر کسی روز پڑھانے میں زیادہ دیر ہو جاتی تو وہ عطا کو رات کا کھانا کھلا کر رخصت کرتی، اسے معلوم تھا کہ عطا دنیا میں تنہا ہے اور عظیم پور میں کسی جگہ ایک چھوٹا سا کمرہ لے کر رہتا ہے اور دونوں وقت ہوٹل میں کھاتا ہے۔

اسے جس دن دفتر سے لوٹنے میں دیر ہو جاتی، اس کا دل گھر کی جانب لگا رہتا، خصوصاً اسے اپنے بابا کی بڑی فکر لگی رہتی، جو ایک کپ چائے کے لیے اس کی آمد کا شدت سے انتظار کرتے رہتے، جس کی وجہ سے اسے دفتر سے سیدھے گھر آجانا پڑتا۔ اس نے بوڑھے باپ اور چھوٹے بھائی بہنوں کے لیے زندگی وقف کر دینے کا فیصلہ کر رکھا تھا اور اس مقصد میں عطا کی ہمدردی نے اُسے بڑی تقویت پہنچائی تھی۔ اس روز عطا نے جب ہفتے کی نصف تعطیل کے بعد اسے رمنہ

پارک کی سیر کرنے کی تجویز پیش کی تو وہ انکار نہ کر سکی۔ وہ ہائی کورٹ کی طرف سے ٹہلتے ہوئے رمنہ پارک پہنچ گئے اور پارک کی گشت لگانے کے بعد ریستوراں میں آ بیٹھے۔

ریستوراں میں بہت کم لوگ تھے اور جو تھے وہ بہت دور بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں تھوڑی دیر جھیل کی طرف دیکھتے رہے، جو وہاں سے بہت ہی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے ویٹر کو ناشتہ اور چائے لانے کا آرڈر دیا اور باتوں ہی باتوں میں اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ صوفیہ اس غیر متوقع صورتِ حال سے گھبرا گئی، لیکن اس سے قبل کے وہ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑاتی، عطا نے اس سے سب کچھ کہہ دیا۔

صوفیہ پر اس کے الفاظ بجلی بن کر گرے اور اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کا شگفتہ اور دمکتا ہوا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا اور اس نے نہایت تلخ لہجے میں کہا "آپ نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ میں کوئی آوارہ لڑکی ہوں جو ہر کسی سے فلرٹ کرتی پھروں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ میری شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔"

پیر کے روز جب دفتر کے لوگوں نے دیکھا کہ صوفیہ خلافِ معمول بہت جلد دفتر آ گئی ہے اور پرسوں کے باقی ماندہ خطوط ٹائپ کرنے میں بہت مصروف ہے اور عطا کا کہیں پتہ نہیں ہے تو انھیں بڑی حیرت ہوئی اور جب دس بجنے کے بعد بھی عطا نہیں آیا تو سلمان صاحب نے اس سے اس کے بارے میں پوچھ ہی لیا، جیسے وہ عطا کے بارے میں ساری باتیں جانتی ہو۔ اس کے ساتھی کلرک عطا کے بارے میں باتیں کر ہی رہے تھے کہ وہ تقریباً گیارہ بجے نہایت بے دلی سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دفتر میں داخل ہوا۔ لوگوں نے دیکھا کہ اس نے نہ تو لباس تبدیل

کیا ہے اور نہ دو دن کی بڑھی ہوئی داڑھی بنائی ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، جیسے وہ رات بھر جاگتا رہا ہو۔

ٹیفین کے وقت جب صوفیہ خلافِ معمول تنہا باہر چلی گئی اور وہ سر جھکائے کام کرتا رہا تو اس کے ساتھیوں کو کچھ شبہ سا ہوا۔ چھ ماہ کے عرصے میں یہ پہلا موقع تھا کہ صوفیہ ٹیفین کے لیے تنہا گئی تھی۔ ان کی ایک دوسرے سے بے رُخی دفتر کے ساتھیوں کی تیز نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکی۔ صوفیہ صبح سے شام تک ٹائپ کرنے میں کئی بار غلطیاں کر چکی تھی اور ایک ہی خط بار بار ٹائپ کر رہی تھی۔ اس سے اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس نے آج پہلی بار پینے کا پانی تاخیر سے لانے پر چپراسی کو ڈانٹ پلائی تھی۔

دوسرے دن وہ جب دفتر سے گھر لوٹی تو رینو نے اسے ایک خط لا کر دیا، جسے دیکھتے ہی وہ پہچان گئی۔ اس نے بے چینی سے لفافہ چاک کیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ عطا نے لکھا تھا۔

صوفیہ صاحبہ۔

اس دن جو کچھ ہوا اس کا مجھے افسوس ہے۔ اس کے لیے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ آپ میری زندگی میں پہلی بار بہار بن کر آئی تھیں اور شاید آخری بار بھی۔ آپ سے مل کر میں خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھ رہا تھا، لیکن افسوس یہ میری غلط فہمی تھی۔ میں شاید اتنا خوش نصیب نہیں کہ میرے خوابوں کی تعبیر سچ ثابت ہوتی۔ مجھے افسوس ہے کہ اس روز میری باتوں سے آپ کو تکلیف پہنچی۔ میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے آپ غلط نہ سمجھیے گا فقط

آپ کا ہمدرد اور ساتھی

عطا

صوفیہ خط پڑھ کر بے چین ہو گئی اور انّو، ٹولو اور رینو کو کھیلنے کے لیے باہر بھیجنے کے بعد

اپنے کمرے میں آکر خط کو کئی بار پڑھا اور زار و قطار روتی رہی۔

دو تین دن کے بعد صوفیہ اور عطا کے تعلقات پھر نارمل ہو گئے، لیکن اس کے بعد کسی نے انھیں ایک ساتھ نہیں دیکھا۔ اب وہ چھٹی کے بعد دفتر سے تنہا نکلتی اور وہ عمداً دفتر میں بیٹھا رہ جاتا۔ صوفیہ دفتر میں اس سے پہلے کی طرح ملتی لیکن وہ مایوس اور بجھا بجھا سا رہتا اور اس کی نگاہیں بچا کر اسے بڑی حسرت سے دیکھا کرتا۔ صوفیہ سب کچھ جان کر بھی انجان بنی رہتی۔

پھر چند دنوں کے بعد عید کے موقع پر بونس کے سوال پر سارے صوبے میں تحریک شروع ہو گئی۔ ہر کارخانہ اور ہر کمرشیل فرم میں بونس کا مطالبہ کیا جانے لگا اور جلسے، جلوس اور مظاہرے کا لامتناہی سلسلہ جاری ہو گیا۔ مرکنٹائل امپلائز فیڈریشن نے بھی دفتروں میں دو ماہ کے بونس کا مطالبہ کر دیا اور دوسرے دفتروں کی طرح اس کے دفتر میں بھی چپراسی سے لے کر ہیڈ کلرک تک اس مطالبے پر متحد ہو گئے، جس کی وجہ سے مسٹر چودھری بہت پریشان ہو گئے۔ بورڈ آف ڈائرکٹرز کی بار بار میٹنگیں ہونے لگیں۔ جن میں آفس کے ملازمین کے مطالبات اور امکانی ہڑتال سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تدابیر سوچی جانے لگیں۔ صوفیہ کے ذریعہ عطا اور دوسرے ساتھیوں کو اندر کی اطلاعات ملتی رہیں۔ صوفیہ ہڑتال کے سلسلے میں اگرچہ سرگرم نہیں تھی لیکن اس کی ہمدردیاں دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ تھیں۔ اسے بھی زائد روپیوں کی ضرورت تھی۔ عید قریب آچکی تھی اور چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں، اس کے بابا اور خود اس کے پاس کوئی سلیقے کا لباس نہیں تھا۔ عید میں بچوں کے لیے نیا لباس بنانا ضروری تھا لیکن وسائل اسے اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ وہ امکانی ہڑتال سے کسی قدر خوف زدہ بھی تھی۔ اگر ہڑتال ناکام ہو گئی اور اس کی ملازمت پر حرف آگیا تو اس کے بوڑھے باپ اور چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کا کیا بنے گا؟ وہ مدد کے لیے کس کے پاس جائے گی؟ کون ان کی مدد کرے گا؟ وہ جب اس کے بارے میں سوچتی تو اس کا دل کانپ اٹھتا اور وہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیتی، پھر بھی دل کا چور اسے ستاتا رہتا۔

آفس یونین کا سکریٹری ہونے کی وجہ سے تمام کام عطا اور اس کے ساتھی شہید الحق کو کرنا

پڑتا تھا اور وہ دونوں انتظامیہ کی نظروں میں چڑھ چکے تھے۔ اس روز بورڈ آف ڈائرکٹرز کی بہت دیر تک میٹنگ ہوتی رہی، جس کے باعث صوفیہ کو دفتر میں رُکنا پڑا۔ بورڈ نے بڑے غور و خوض کے بعد بالآخر فیصلہ کیا کہ اس سال چوں کہ کمپنی کو زبردست خسارہ ہوا ہے اس لیے ملازمین کو کوئی بونس نہیں دیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ ہی عطا اور شہید الحق کو برطرف کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ صوفیہ کو جب بورڈ آف ڈائرکٹرز کے فیصلے کے ساتھ ان دونوں کی برطرفی کا نوٹس ٹائپ کرنے دیا گیا تو وہ بہت پریشان ہوگئی۔ دفتر میں چھٹی ہو چکی تھی اس لیے وہ یہ اہم خبر اپنے ساتھیوں کو بھی نہ پہنچا سکی، لیکن دوسرے روز صبح کو دفتر کے تمام لوگوں کو اس کا علم ہو گیا۔

مسٹر چودھری کے دفتر میں داخل ہوتے ہی جسے سب سے پہلے بلایا گیا وہ عطا تھا۔ دفتر کے لوگوں میں پہلے ہی زبردست ہیجان پیدا ہو چکا تھا چنانچہ وہ مسٹر چودھری کے ایرکنڈیشنڈ چیمبر میں داخل ہوا تو سب لوگ اس کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ صوفیہ بھی اپنا کام چھوڑ کر اس کا انتظار کرنے لگی اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ جب چیمبر سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں برطرفی کا لیٹر تھا اور ہونٹوں پر افسردہ مسکراہٹ۔ یہ حملہ قطعی غیر متوقع تھا، جس کے لیے کوئی بھی ذہنی طور پر آمادہ نہ تھا، چنانچہ اسٹاف میں شدید اشتعال پیدا ہو گیا اور لوگ اس کے ہاتھ سے برطرفی کا لیٹر لے کر پڑھنے لگے۔ کمپنی کے اس حملے کا سب نے پوری قوت کے ساتھ مزاحمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ دفتر کے ساتھیوں نے عطا سے ذاتی ہمدردی ظاہر کی اور اس کا حوصلہ بڑھایا لیکن صوفیہ اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ بار بار نہایت حسرت کے ساتھ صوفیہ کی طرف دیکھتا اور پھر نظریں جھکا لیتا، جیسے وہ آخری بار اسے نظر بھر کر دیکھ رہا ہو۔ صوفیہ اپنی میز پر افسردگی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس نے اس کی محبت کو بے دردی سے ٹھکرا دیا تھا، جس کی وجہ سے وہ خود کو مجرم سمجھ رہی تھی اور نادم تھی۔ وہ اس سے دلی ہمدردی رکھنے کے باوجود اس سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ دفتر میں سب نے کمپنی کے اس فیصلے کو عدالت میں چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا اور وکیل سے مشورے کے بعد دوسرے روز صبح نو بجے ہنگامی جلسہ

طلب کیا اور عطا آفس کا وقت ختم ہونے سے بہت پہلے چلا گیا۔

عطا کے جانے کے بعد بھی وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی اور اس کے دل میں عطا سے گہری ہمدردی اور محبت پیدا ہو گئی۔ دفتر سے چھٹی ہوتے ہی وہ سیدھے اس کے گھر روانہ ہو گئی۔ وہ اس سے قبل صرف ایک بار اس کے گھر گئی تھی، اس لیے اس کا گھر تلاش کرنے میں دقت نہیں ہوئی۔ وہ جب اس کے گھر کے سامنے پہنچی تو سیڑھی پر چڑھتے ہوئے چند لمحے ہچکچائی، اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، آخر کار اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے زینہ طے کیا اور اس کے کمرے کے سامنے آکر دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے پھر دستک دی، اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے جب دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا تو اس کے دونوں پٹ کھل گئے اور ہوا کے جھونکوں سے کمرے میں بکھرے ہوئے کاغذات اڑنے لگے۔